خطبات شبلی

(نو دریافت)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی

خطبات شبلی

(نو دریافت)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سلسلہ مطبوعات دارالمصنّفین نمبر: ۲۵۷

- نام کتاب : خطبات شبلی ۔ نو دریافت
- مرتب : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- ناشر : دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
- سنہ طباعت : اکتوبر ۲۰۲۱ء
- صفحات : ۱۴۴
- قیمت : Rs : 150/-

ISBN: 978-81-952765-9-2

باہتمام

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

Darul Musannefin Shibli Academy
Post Box No: 19,Shibli Road Azamgarh 276001
e-mail: shibli_academy@rediffmail.com
www.shibliacademy.org www.shiblibooks.com

ترتیب

•••

پیش لفظ

اردو زبان وادب کے فروغ واشاعت اوراسے علمی موضوعات کا وسیلہ اظہار بنانے میں جن بزرگوں نے نمایاں کردار ادا کیا ان میں علامہ شبلی کا نام سرفہرست ہے۔ علامہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ عام طور سے ان کی معرکہ آرا علمی تصانیف کو ان کی عظمت و شہرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی تصانیف تاریخ، سیرت، ادب اور تنقید کے سرمائے میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اردو زبان میں قابل قدر پیش رفت ہونے کے باوجود علامہ شبلی کی مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کی معنویت میں ذرا بھی کمی نہیں واقع ہوئی۔ سیرت النبیؐ، سیرت النعمان، المامون، شعرالعجم اور موازنۂ انیس ودبیر وغیرہ کو آج بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

علامہ شبلی کی تصنیفی صلاحیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ وہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مصنف ہی نہیں مصنف گر بھی تھے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علامہ کی شہرہ آفاق عظمت وشہرت میں ان کے زور خطابت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ علامہ کو تقریر و خطابت کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ علامہ نے مسلم یونیورسٹی کے مختلف جلسوں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں اور ندوہ تحریک میں نئی روح پھونکنے کی غرض سے منعقد ہونے والے جلسوں میں جو تقریریں کیں وہ اپنے مواد، علمیت اور زور بیان کی وجہ سے دلوں کو مسخر اور ذہنوں کو محور کرلینے والی ہیں۔ علامہ شبلی کو علمی وادبی موضوعات سے خصوصی ذہنی مناسبت تھی

لہٰذا ان موضوعات پر ان کی تقریریں ساحرانہ کیفیت کی حامل ہیں لیکن انہوں نے ختم نبوت، علم کلام اور تصوف کے موضوعات پر جو تقریریں کی ہیں وہ بھی اپنی علمیت اور زور بیان کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ سنجیدگی، متانت اور زور بیان کے ساتھ ساتھ علمیت سے بھرپور علامہ کی تقریریں اردو زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

علامہ شبلی کے خطبات کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے دارالمصنّفین نے ان خطبات کو مولانا عبدالسلام ندوی کے پرمغز مقدمہ کے ساتھ خطبات شبلی کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو بہت سے ایسے خطبات دستیاب ہوئے جو خطبات شبلی میں شامل نہیں تھے۔ زیرنظر کتاب انہیں نو دریافت خطبات پر مشتمل ہے۔ الیاس صاحب نے اپنے محققانہ مقدمے میں ان خطبات کی علمی و تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ علامہ کے ان خطبات نے اس زمانے کی مختلف تحریکوں میں نئی روح پھونکنے میں کتنا موثر کردار ادا کیا، ہمیں پوری امید ہے کہ یہ کتاب شبلی شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگی اور ڈاکٹر الیاس صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح اسے بھی علمی حلقوں میں خاطرخواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

(ڈاکٹر) فخر الاسلام اعظمی

۵/اکتوبر ۲۰۲۱ء

تقدیم

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ایک بڑے مقرر اور خطیب بھی تھے۔ان کا شمار ایسے کم یاب اہل علم وکمال اور مصنّفین میں ہوتا ہے جنہیں تحریر وتقریر میں یکساں عبور حاصل تھا۔ بلاشبہ علامہ شبلی ایسے ہی کم یاب اشخاص میں سے ایک تھے۔ان کے ادب وانشا اور اس کی سحر انگیزی کا ایک زمانہ معترف ہے۔البتہ ان کے جوہر خطابت سے نسبتاً کم لوگوں کو واقفیت ہے۔اور اس کا کم ذکر کیا جاتا ہے۔حالانکہ اس میدان میں بھی وہ کم رتبہ نہ تھے۔اور معاصرین میں تو انہیں بلاشبہ تفوق حاصل تھا۔

مشرقی یوپی کا مردم خیز ضلع اعظم گڑھ تو ان کا وطن ہی تھا۔علی گڑھ، حیدرآباد، دہلی، بھوپال، لکھنو، رام پور اور بمبئی وغیرہ مقامات کے متعدد اجلاسوں اور کانفرنسوں کو انہوں نے خطاب کیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس سے وہ ۲۷۔سال وابستہ رہے۔اور اس کے سالانہ اجلاسوں میں وہ ہوتے اور کسی منتخب موضوع پر تقریر کرتے یا تعلیم کے موضوع پر قراردادیں پیش کرتے اور اس کے مباحثوں میں بھی حصہ لیتے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں سے علامہ شبلی کی خطابت کے جس سلسلہ کا آغاز ہوا وہ درازتر ہوتا گیا۔حیدرآباد کے جلسوں، انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاسوں اور اخیر میں مسلسل نو برس تک ندوہ کے سالانہ اجلاسوں میں وہ بڑے اہتمام سے

شریک ہوتے اور خطاب کرتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ سامعین کو مسحور کر دیتے۔

ندوہ کی رودادوں میں علامہ شبلی کے کئی خطبات درج ملے، جنہیں مولانا عبدالسلام ندوی نے خطبات شبلی میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک خطبہ جو شامل ہونے سے رہ گیا تھا راقم اسے اس دوسرے حصہ میں شامل کر دیا ہے۔۔ ان کے عزیز شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] نے ان کی خطابت کے بارے لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی نعمانی جن اوصاف وخصوصیات کا مجموعہ تھے ان میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ ان میں زور تحریر کے ساتھ قوت تقریر کا ملکہ بھی پایا جاتا تھا۔ .... علی گڑھ جانے کے بعد جب ان کی پبلک زندگی کا آغاز ہوا تو اس ملکہ خداداد نے پوری نشو ونما حاصل کی اور وہ علی گڑھ کالج کی سوسائٹیوں اور کانفرنس کے جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اس کے جلسوں میں بھی ان کی تقریروں نے خاص طور پر اہمیت حاصل کی اور وہ ہندوستان کے بے مثل اور بے نظیر خطیب اور مقرر تسلیم کئے جانے لگے۔''(خطبات شبلی ص۵)

علامہ شبلی نعمانی ابتدا میں مناظر تھے۔ بالخصوص اہل حدیث علماء سے ان کے بڑے معرکے رہے۔ اس میں بھی انہوں نے اپنے حریف مقابل کو زیر کرنے کے لئے تحریر وتقریر دونوں سے کام لیا۔ اس سلسلہ کی تقریروں کا کوئی نمونہ تو نہیں ملتا، البتہ دو مطبوعہ رسالے (ظل الغمام اور اسکات المعتدی علی انصات المقتدی) موجود ہیں۔ ان مناظروں نے ان میں منطقی انداز اور حسن استدلال کے جوہر پیدا کئے، جو بعد میں خطابت میں بہت کام آئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ

> ''خوش قسمتی سے تقریر وزور بیان کے لئے جس قدر لوازم واوصاف

ضروری ہیں وہ سب ان میں قدرتی طور پر موجود تھے۔ قد نہایت بلند بالا تھا، اس لئے جب اسٹیج پر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ہر شخص کے سامنے ظاہری حیثیت سے بھی ایک نمایاں شخصیت آجاتی تھی۔ آواز بلند اور گونجنے والی تھی۔ اور اول سے آخر تک یکساں حالت میں قائم رہتی تھی۔ مزاج میں نہایت اشتعال اور جوش وخروش پایا جاتا تھا، اس لئے ان کی تقریریوں میں قدرتی طور پر زور اور جوش بیان پیدا ہوجاتا تھا۔'' (خطبات شبلی ص۵-۶)

فنی اعتبار سے بھی ان کے خطبات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جامعیت کے ساتھ ان کے خطبات کی ایک خوبی ایسی ہے کہ اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ اور وہ ہے ان کی علمیت۔ ان کے خطبات، خطبات سے زیادہ علمی مقالات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر خطبہ دیتے گویا اپنے سامعین کو ایک علمی مقالہ سنا دیتے تھے۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] نے علامہ شبلی کے اس جوہر خطابت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''یہ قدرت آج صرف انہیں (شبلی) حاصل ہے کہ جس موضوع پر چاہتے ہیں ایک مرتب اور مدون تصنیف حاضرین کو سنا دیتے ہیں۔ ان کا لکچر بلحاظ ترتیب مطالب اور حسن استدلال ایک مکمل رسالہ ہوتا ہے، جس کو اگر قلم بند کر دیا جائے تو نظر ثانی کی بھی ضرورت نہ ہو اور بلا تامل رسائل شبلی میں ایک اضافہ ہوجائے۔''

(ماہنامہ الندوہ اپریل ۱۹۱۰ء، ص ۱۱)

علامہ شبلی کے ذوق خطابت کا یہ طرۂ امتیاز بھی تھا کہ ہر موضوع پر تقریر نہ کرتے بلکہ وہ منتخب موضوعات پر خطبات دیتے تھے۔ اس خوبی کا بھی مولانا عبدالسلام ندوی نے ذکر کیا

ہے اور لکھا ہے کہ

"عام واعظوں اور پیشہ ور مقرروں کی طرح ہر موضوع پر محض تقریر کرنے کے لئے تقریر نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف اسی موضوع کا انتخاب کرتے تھے جس کو وہ خود محسوس کرتے تھے۔ اور ملک وقوم کے لئے اس کو ضروری سمجھتے تھے، اس لئے ان کے طبعی احساس اور ملک و قوم کی عام ضرورت کے لحاظ سے ان کی تقریروں میں خود بخود زور و اثر پیدا ہو جاتا تھا۔" (خطبات شبلی ص ۶)

ادیب شہیر اور صاحب شعر الہند مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے استاذ کے مختلف موضوعات پر پندرہ خطبات یکجا کر کے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا۔ گذشتہ ۸۰۔ برس سے یہی مجموعہ خطبات شبلی اہل ذوق کی علمی تشنگی بجھا رہا ہے۔

خطبات شبلی کی اشاعت کے بعد پھر علامہ شبلی کے دیگر خطبات کی طرف توجہ نہیں دی جاسکی۔ راقم کے مطالعہ شبلی میں علامہ شبلی کی جہاں اور بہت سی تحریریں دریافت ہوئیں وہیں چند مختصر اور بعض طویل خطبات بھی ہاتھ آئے۔ یہ خطبات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، روداد ندوہ، روداد انجمن حمایت اسلام لاہور اور بعض دیگر رسائل وجرائد سے دریافت ہوئے ہیں۔ افادیت کے پیش نظر بعض کو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اور دوسرے رسائل میں شائع بھی کیا گیا ہے۔ لیکن عام استفادہ کے خیال سے کسی کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا خیال نہیں آیا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ یہ سعادت میرے مقدر میں آئی۔ چنانچہ راقم نے انہیں یکجا کیا اور اولاً علامہ شبلی کی نادر تحریروں کے مجموعہ "نوادرات شبلی" میں شائع کیا۔ اس کے بعد جب چند اور خطبات ہاتھ آ گئے تو انہیں کتابی صورت میں عام استفادہ کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ یکجا شائع کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان نو دریافت خطبات شبلی کے موضوعات میں بھی بڑا تنوع، طرفگی اور جامعیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ان میں تعلیم اور اعلیٰ

تعلیم وتربیت اور جبری تعلیم پر بھی خطبات شامل ہیں۔مغربی علوم وفنون کے ساتھ تصوف و سلوک پر بھی خطبات ہیں۔ایک بڑا عالمانہ خطبہ ختم نبوت کے موضوع پر بھی شامل ہے۔ بحیثیت مجموعی علامہ شبلی کے گذشتہ مجموعہ خطبات سے اس مجموعہ خطبات کی حیثیت اور افادیت کسی نوع سے کم نہیں ہے۔

راقم کو یہ خطبات جن کتب ورسائل سے ملے، ہر خطبہ کے اختتام پر ان کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔یہی نہیں اس میں ضرورت کے مطابق وضاحتی نوٹس بھی لکھے گئے ہیں۔آیات و احادیث کی تخریج بھی کی گئی ہے۔ان شخصیات وواقعات کا ذکر حواشی میں کیا گیا ہے، جن کا ذکر خطبات میں آیا ہے اور جہاں جہاں وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، وہاں وہاں وضاحت بھی کی گئی ہے۔یہ سب دقتیں اس لئے اٹھائی گئی ہیں کہ ''خطبات شبلی'' کے اس نئے مجموعہ کی تفہیم سہل اور آسان ہو سکے۔

ان نو دریافت خطبات کی تفصیل اور ان کا پس منظر یہاں درج کیا جاتا ہے:

پہلا خطبہ: تہنیت

پہلا خطبہ جس کا عنوان تہنیت ہے، اسے علامہ شبلی کی پہلی تقریر ہونے کا شرف حاصل ہے۔مئی ۱۸۸۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس اولڈ فیلڈ کی جگہ سر سید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے صاحبزادے سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] کا تقرر ہوا۔سید صاحب ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج تھے۔اس خوشی میں ضلع اعظم گڑھ میں ۳۱/جولائی ۱۸۸۲ء کو ایک تہنیتی جلسہ منعقد ہوا۔جلسہ کی صدارت ضلع اعظم گڑھ کے راجہ، راجہ سلامت شاہ [۱۸۳۵-۱۹۱۲ء] نے کی تھی۔اس جلسہ کے سکریٹری علامہ شبلی تھے۔اس میں اعظم گڑھ اور قرب وجوار کے عمائدین اور رؤسا نے شرکت کی۔اعظم گڑھ کے ان ممتاز اشخاص کے جو تحریک علی گڑھ کے اولین حامی تھے ان کے نام یہ ہیں۔

راجہ سلامت شاہ، مرزا قمر الدین منصف، مولوی انعام اللہ خاں، منشی محمد اکرام وکیل

سرکاری، اسد اللہ وکیل عدالت، شاہ عبدالعلیم وکیل، شاہ عبدالقدیر وکیل، مولوی توجہ حسین وکیل، منشی چھیدی لال سررشتہ دار، شاہزادہ عالی قدر مرزا احسن بخت پیش کار، شیخ حبیب اللہ وکیل، بابو محمد اصغر خاں رئیس سدھاری، خواجہ مولوی ولی اللہ خاں رئیس شہر، خواجہ احسن اللہ خاں رئیس شہر، سید محمد قائم رئیس محمد آباد گہنہ، شاہ شجاعت عالم رئیس مئو، مولوی محمد شبلی نعمانی۔

اس موقع پر متعدد مقررین نے تقریریں کیں اور سید محمود کو اس کامیابی پر مبارک باد دی اور حکومت کا بھی شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے بھی تقریر کی تھی جو مورخہ ۱۵/اگست ۱۸۸۲ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔ اور ''خطبات شبلی'' مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی میں شامل نہیں ہوسکی ہے۔

واضح رہے کہ اس تقریر کی دریافت کا سہرا ممتاز مصنف پروفیسر اصغر عباس صاحب سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سر ہے۔ انہوں نے ایک نوٹ کے ساتھ اسے ماہنامہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ اکتوبر ۲۰۱۱ء میں شائع کرایا ہے۔ ہم نے اس تقریر کو ان کے اور مدیر ماہنامہ کانفرنس گزٹ کے شکریہ کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

دوسرا خطبہ: اعلی تعلیم کی ضرورت

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لئے علی گڑھ کالج کے علاوہ ایک تعلیمی تنظیم آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس قائم کی تھی جو آج بھی قائم ہے۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۷/دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں مولوی سمیع اللہ خاں کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کے پہلے اجلاس کا پہلا رزولیشن سرسید احمد خاں نے پیش کیا اور دوسرا رزولیشن علامہ شبلی نے پیش کیا تھا۔ علامہ شبلی کا یہ خطبہ دراصل اسی رزولیشن کی تائیدی تقریر ہے۔ علامہ کے اس رزولیشن کی سرسید نے زبردست حمایت کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو تقریر کی تھی وہ خود بہت اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے بھی علامہ کی تقریر کے ساتھ ہی حاشیہ میں نقل کردیا گیا ہے۔

مولوی ریاض الدین صاحب نے اس رزولیشن کی سخت مخالفت کی تھی۔ان کا خیال تھا کہ

''گورنمنٹ کو خاص مشرقی علوم کی نسبت بھی توجہ کرنی چاہئے۔اور مشرقی علوم کے جو عالم ہیں ان کی قدر ومنزلت کرنی اور ان کو اعزاز دینا اور درباروں میں کرسیوں کی نشست عطا کرنا لازم ہے۔اور بغیر گورنمنٹ کی توجہ کے مشرقی علوم کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔(محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا پہلا جلسہ ص ۳۲)

مولوی مرزا فتح محمد بیگ صاحب نے مولوی ریاض الدین صاحب کے موقف پر تنقید کی اور دلائل سے ان کی تردید اور شبلی و سر سید کے موقف کی تائید کی۔یہ مباحث ہم نے اس لئے نقل کئے ہیں کہ اس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ علامہ شبلی کی یہ قرارداد اور تقریر کس قدر اہم ہیں۔

تیسرا خطبہ: مغربی علوم وفنون

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے ہی اجلاس میں علامہ شبلی نعمانی نے مندرجہ بالا موضوع پر پہلے ایک قرارداد پیش کی، پھر اپنے موقف کی تائید میں مختصر سی تقریر بھی کی۔یہ قرارداد اور تقریر کا خلاصہ کارروائی یازدہ سالہ من ابتدائے ۱۸۸۶ء لغایت ۱۸۹۶ء محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ۱۸۹۷ء میں شامل ہے۔ہم نے اسے مجلّہ صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۱ء سے نقل کیا ہے۔اس کا عنوان ''مغربی علوم وفنون'' ہمارا ہی طے کیا ہوا ہے۔

چوتھا خطبہ: اعلیٰ تعلیم یا ادنیٰ تعلیم

یہ تقریر بھی علامہ شبلی نے دراصل ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۸۸۶ء ہی کے اجلاس میں بطور رزولیشن پیش کرتے ہوئے کی تھی۔تقریر سے پہلے انہوں نے کہا کہ

اے معزز صاحبان جلسہ!

مجھے اس بات کی عزت دی گئی ہے کہ اس قومی تعلیمی کانگریس میں جو ہماری عام تعلیمی ضرورتوں پر غور کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے، دوسرا رزولیشن پیش کروں جو مندرجہ ذیل ہے:

''اس جلسہ کی رائے میں مسلمانوں کو مغربی علوم اور انگریزی زبان دانی میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔ قوم اور گورنمنٹ دونوں کو اس پر توجہ دینا چاہئے۔ انگریزی کالجوں میں مشرقی تعلیم کا بطور سکنڈ لینگوج یعنی دوسری زبان کے رہنا کافی ہے۔ خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ درکار نہیں ہے۔ وہ جس طرح کہ ہمارے قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے عالموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے، اس کو اسی طرح پر رہنا چاہئے اور خود ہماری قوم کو اس کے باقی اور قائم رہنے پر ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہوں، توجہ رکھنی لازم ہے۔ مشرقی علوم جو مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہو سکتے اور اس لئے گورنمنٹ کو اس کا اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور اگر مذہبی مسائل کو اس سے خارج رکھا جاوے تو کوئی شخص جو مشرقی علوم کا خواہاں ہے اس کو پسند نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے اس کو اختیار کرے گا تو مسلمان کمیونٹی یعنی اسلامی گروہ میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔'' (باقیات شبلی ص ۲۹-۳۰)

اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے اپنے رزولیشن کی تائید میں کانفرنس سے خطاب کیا۔ موضوع کی مناسبت سے بے حد اہم تقریر ہے۔

پانچواں خطبہ: الاسلام

علامہ شبلی انجمن حمایت اسلام لاہور کے متعدد اجلاسوں میں شریک ہوئے اور خطاب کیا۔۱۸۹۵ء میں اس کا پہلا اجلاس ہوا تھا، جس میں سر سید احمد خاں اور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی نے بھی شرکت کی تھی اور ایک جلسہ سے خطاب بھی کیا تھا، مگر اس خطبہ کا اب کہیں سراغ نہیں ملتا۔ جناب حنیف شاہد نے علامہ شبلی کے حوالہ سے انجمن حمایت اسلام کی رودادوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ انہیں ۱۹۰۳ء کے اجلاس کا خطبہ شبلی کسی روداد میں ملا تو اسے انہوں نے مجلّہ صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء میں اپنے مقالہ میں شائع کیا ہے۔ ہم نے وہیں سے اسے نقل کیا ہے اور اسی سے ہمیں یہ اطلاع بھی ملی کہ علامہ شبلی نے انجمن حمایت اسلام کے ۱۹۰۳ء کے اجلاس میں بھی شرکت کی تھی۔

یہ خطبہ تحریری تھا، مگر علامہ شبلی نے تحریری خطبے کے بعد زبانی خطبہ بھی دیا تھا۔ نقل نویسوں نے یہ خیال کر کے کہ خطبہ تحریری ہے آخر کا خطبہ نقل نہیں کیا جو بقول مرتب روداد انجمن حمایت اسلام لاہور خطبے کی جان تھا۔ البتہ انہوں نے اس کا خلاصہ روداد میں درج کیا ہے، جسے راقم نے اصل خطبہ کے آخر میں نقل کر دیا ہے۔ اس سے خطبہ بڑی حد تک مکمل ہو جاتا ہے۔

چھٹا خطبہ: فارسی زبان وادب

عہد شبلی میں انگریزی حکومت نے بی.اے. کے نصاب سے فارسی کو خارج کر دیا تھا۔ علامہ شبلی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے موقف کی تائید میں محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس کے تیرہویں سالانہ اجلاس میں جو ۱۹۰۱ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا تھا، نہایت پرزور تقریر کی۔ خود گورنر بنگال سر جان ووڈبرن نے بڑے غور سے ان کی تقریر سنی۔ مسٹر محمد شفیع، مسٹر عبدالرحمٰن اور نواب محسن الملک نے بھی علامہ شبلی کی تائید کی اور بالاتفاق یہ قرارداد منظور ہوئی کہ نصاب سے فارسی زبان خارج نہ کی جائے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

''مولانا نے اس تجویز کی تائید میں ایک نہایت پرزور تقریر کی، جس میں انہوں نے مخالفین کے اس اعتراض کا کہ فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم وفنون اور حقیقی شاعری ہے، ایسی خوبی سے جواب دیا کہ لوگ حیران وششدر رہ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ علوم وفنون کی وہ تمام شاخیں جو عربی میں ہیں وہ فارسی میں بھی موجود ہیں۔ فلسفہ، منطق اور علم وادب کی مکمل تصانیف اس میں ہیں اور مسلمانوں کے پچھلے عہد زریں کی تاریخ کی وہی تنہا سرمایہ دار رہی۔ پھر انہوں نے مسلمان بادشاہوں کی فارسی میں خودنوشت سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا، جس کا جواب کسی زبان میں موجود نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے فارسی کی فلسفیانہ شاعری کو بڑی خوبی سے بیان کیا۔ ساتھ ہی ساتھ مثال کے طور پر فارسی کے بیسیوں اشعار پڑھ کر سنائے۔ سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

(حیات شبلی ص ۲۱۱، طبع جدید)

علامہ شبلی کی یہ تقریر ''خطبات شبلی'' میں شامل نہیں ہوسکی تھی۔ اسے اقبال احمد مجددی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۶۸ء میں شائع کرایا ہے۔ یہ نادر خطبہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

ساتواں خطبہ : علم کلام

۱۹۰۱ء میں علامہ شبلی نعمانی نے حیدرآباد کا سفر کیا۔ اس موقع پر وہاں کے اہل علم اور بعض امرا کی خواہش پر ۱۵۔ مارچ ۱۹۰۱ء کو باغ عامہ حیدرآباد میں علم کلام کے موضوع پر لکچر دیا۔ جسے بے حد پسند کیا گیا۔ محمد ابراہیم خاں اکبرآبادی مہتمم مطبع شمسی حیدرآباد دکن نے

اسے کتابچہ کی صورت میں شائع کیا ہے۔اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

’’جن معدودے چند بزرگوں نے نئے علم کلام کی ضرورت کومحسوس کیا ہے ان میں سے ایک اسلامی پرانی تاریخ میں تازی روح پھونکنے کے شیدائی جناب مولانا شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی بھی ہیں۔لیکن سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کا احساس دانش مندانہ وہمدردانہ ہے۔انہوں نے نہ صرف خود سمجھ لینے یا زیادہ سے زیادہ چند دوسرے لوگوں کو سمجھا دینے پر ہی اکتفانہیں کی ہے بلکہ احساس سے قول اور قول سے گذر کر عمل وفعل میں اس کو جلوہ دیا ہے۔ مولانائے ممدوح شکراللہ سعیہ کا وہ لکچر جوانہوں نے ۱۵۔مارچ ۱۹۰۱ء کو باغ عامہ میں دیا تھا چونکہ نئے علم کلام کی واقعی ضرورت کو بتاتا اور اس کا عمدہ نمونہ بھی پیش کرتا ہے،اس لئے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ ایک رسالہ کی شکل میں چھاپ کر شائع کیا جائے تاکہ مسلمان صاحب ہوش وذی فہم عموماً اور طبقہ علماء جو حامی دین ومذہب ہے خصوصاً اپنی توجہ اس طرف مبذول فرمائیں۔‘‘(لکچر ص۳۔۴)

یہ کتابچہ راقم کی نظر سے گذرا ہے، بلکہ اس کی پی ڈی ایف بھی میرے پاس محفوظ ہے۔اسے وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔

آٹھواں خطبہ: ندوۃالعلماء کی ضرورت

علامہ شبلی ندوہ کے اجلاسوں میں مستقل خطاب کیا کرتے تھے۔ندوہ کی ضرورت، قیام ندوہ کے اسباب ومحرکات اور مقاصد،ندوہ کا نصاب تعلیم وغیرہ ان کے مستقل اور محبوب موضوعات تھے۔اس سلسلہ کی ان کی بعض تقریریں مولانا عبدالسلام ندوی نے خطبات شبلی میں شامل کی ہیں۔اتفاقاً اس موضوع پر ایک اور تقریر روداد ندوہ میں نظر آ گئی جو خطبات شبلی

میں شامل نہیں ہے۔اس میں ندوہ کی ضرورت پر بہت اہم دلائل و براہین سے کام لیا گیا ہے۔

نواں خطبہ: ختم نبوت

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نواں سالانہ اجلاس امرت سر میں منعقد ہوا تھا۔علامہ شبلی نعمانی اس میں شریک ہوئے تھے اور ''ختم نبوت'' کے عنوان سے ایک تفصیلی خطبہ دیا تھا۔ اس جلسہ کی روداد اور علامہ شبلی نعمانی کے خطبہ کی تلخیص ہفت روزہ اخبار وکیل امرت سر کے ۱۷/اکتوبر۱۹۰۲ء و ۲۷/اکتوبر۱۹۰۲ء کے شماروں میں شائع ہوئی ہے۔زیرنظر کتاب میں وہی رپورٹ بطور ایک خطبہ شامل ہے۔

دسواں خطبہ : تعلیم و تربیت

انجمن حمایت اسلام لاہور کے ۱۹۰۹ء کے سالانہ جلسے میں بھی علامہ شبلی نے شرکت کی تھی۔ یہ سالانہ جلسہ ۹/سے ۱۱/اپریل ۱۹۰۹ء یعنی تین دن تک جاری رہا۔علامہ شبلی نے پہلے اجلاس کی صدارت کی اور ایک اجلاس میں خطاب کیا۔ یہ خطبہ جناب حنیف شاہد نے مجلّہ صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء میں روداد انجمن حمایت اسلام سے نقل کیا ہے۔ یہ تقریر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۶۷ء میں بھی شائع ہوئی ہے۔تعلیم و تربیت کے موضوع پر یہ بے حد اہم خطبہ ہے۔

گیارھواں خطبہ: تصوف

علامہ شبلی نے ملک کے مختلف حصوں میں خطبات دیے۔اسی طرح کا ایک خطبہ انہوں نے دہلی میں بھی دیا تھا۔ جو''خطبات شبلی''میں شامل نہیں ہے۔

۲۰۱۸ء میں راقم نے علامہ شبلی کی نادر تحریروں کا مجموعہ ''نوادرات شبلی'' شائع کیا تو اس میں سات نو دریافت خطبات شبلی شامل کئے تھے۔ یہ آٹھواں خطبہ ''تصوف'' بالکل تازہ دریافت ہے۔

پندرہ برس پہلے راقم نے علامہ شبلی کی نادر و نایاب اور منتشر تحریروں کی شیرازہ بندی

کے جس منصوبے کا آغاز کیا تھا اور جو کئی جلدوں پر محیط ہوا۔ سخت تعجب ہے کہ وہ سلسلہ ابتک جاری ہے۔ زیرِنظر خطبہ کی دریافت اس سلسلہ کی تازہ مثال ہے۔

علامہ شبلی نعمانی ۱۷ رستمبر ۱۹۰۹ء کو دہلی پہنچے۔ (باقیات شبلی ص ۱۳۸) اور اپنے دوست خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۶-۱۹۵۵ء] کی خواہش کو متعدد احباب کی خواہشوں پر ترجیح دی اور ان کے یہاں قیام کیا۔ یہ قیام نواب غلام نصیر الدین عرف نواب بڈھن میاں رئیس شیخوپورہ کی محل سرا واقع چتلی قبر دہلی میں تھا۔ یہ محل سرا اس وقت خواجہ صاحب کے تصرف میں تھی۔ ماہنامہ نظام المشائخ کا دفتر بھی اسی میں تھا۔ یہاں علامہ شبلی کا قیام ایک ماہ رہا۔ وہ اپنا باورچی ساتھ لے کر آئے تھے۔ سالن خود بناتے بقیہ کام باورچی نپٹاتا۔ اس مدت میں انہوں نے سوائے لالہ چندو لال چانول والے کے جو دہلی کے ایک رئیس اور شاعر تھے کسی کی دعوت قبول نہیں کی۔ اور یہ دعوت بھی انہوں نے خواجہ صاحب کی خواہش پر قبول کی تھی۔ (ایضاً)

اس قیام دہلی میں بقول علامہ شبلی دو تین لکچر ہوئے۔ (عظمت رفتہ ص ۲۶۶-۲۶۷۔ ادارہ علم وفن کراچی، ۲۰۰۰ء) مگر ان کے اس سفر کے واقعہ نگاروں نے ان کی دو تقریروں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تقریر انہوں نے جامع مسجد میں حوض کے پاس چاندنی رات میں کی تھی اور دوسری تقریر کا اہتمام خواجہ حسن نظامی نے اسی نواب بڈھن میاں کی محل سرا میں کیا تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں خواجہ صاحب کی اہلیہ سخت علیل تھیں اور پھر اسی علالت میں وہ انتقال بھی کر گئیں، لیکن خواجہ صاحب کے معمولات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ (ایضاً ص ۲۶۶) علامہ شبلی نے ان سے کہا کہ

> ''خواجہ صاحب میری بیوی کا جب انتقال ہوا تھا میں پاگل سا ہو گیا تھا لیکن آپ ہیں کہ برابر اپنے مشاغل میں مصروف ہیں، گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ آپ واقعی بہت مضبوط طبیعت کے انسان ہیں۔'' (ایضاً)

اسی حال میں خواجہ صاحب نے عمائدین دہلی کو مدعو کیا اور تعجب ہوتا ہے کہ تصوف جیسا خشک موضوع ہونے کے باوجود تقریباً دو ہزار افراد اس جلسے میں شریک ہوئے۔ اس کی تفصیل خود خواجہ صاحب نے ماہنامہ نظام المشائخ دہلی میں لکھی ہے۔ انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''مرحومہ کی نازک علالت کے زمانہ میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی دہلی تشریف لائے اور باوجود تمام عمائدین دہلی کے اصرار کے انہوں نے میری عرض قبول فرمائی اور حلقہ کی منزل گاہ میں قیام فرمایا۔ اراکین و خدام حلقہ نے خواہش کی کہ اگرچہ مولانا کے علمی کارناموں کا تمام اسلامی دنیا میں غلغلہ ہے اور مشائخ تصوف کے حالات سے بھی مولانا نے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے، جس کا ثبوت سوانح مولانا روم ہے، مگر آج تک مولانا کی زبان سے تصوف کی حقیقت کے بارہ میں کچھ نہیں سنا۔ کیا اچھا ہو کہ حلقہ میں مولانا کا ایک بیان تصوف پر ہو جائے۔ مولانا نے اس خواہش کو قبول فرمایا، مگر ساتھ ہی ازراہ انکسار اس کوچہ سے نابلد ہونے کا عذر کیا۔ القصہ اس روحانی جلسہ کا عام طور سے اشتہار تقسیم کیا گیا۔ اور دو ہزار کے قریب عمائدین و عوام ہندو مسلمانوں کا مجمع منزل گاہ حلقہ میں ہو گیا۔ جامع مسجد کے امام صاحب صدر بنائے گئے۔ شفاء الملک حکیم رضی الدین احمد خاں صاحب کی طرف سے حاضرین کو مولانا کی تعریف سنائی گئی۔ اور جناب قاری سرفراز حسین صاحب چشتی نظامی سیاح جاپان نے اول اغراض حلقہ کے متعلق نہایت مشرح و مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد کامل دو گھنٹہ مولانا شبلی نے اپنا عارفانہ لکچر دیا۔ یہ بیان علاحدہ چھاپا

جار ہا ہے۔ مولانا نے تصوف کو تین حصوں میں تقسیم کر کے دکھایا۔ اول فلسفہ، دوم اخلاق، سوم حال۔ ان تینوں کی تشریح میں اس قدر واقفیت اور معلومات ظاہر کی کہ لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ وحدت وجود کو وحدت شہود پر ترجیح دینے میں کمال دکھا دیا۔ الغرض بیان ہمہ وجوہ مکمل اور پسندیدہ تھا اور بقول مولانا شبلی یہ پہلا دن تھا جو انہوں نے تصوف کے متعلق تقریر کی۔''

(ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، رمضان المبارک ۱۳۲۷ء، ص ۶۱-۶۲)

ملا واحدی نے اپنی کتاب ''تاثرات'' میں لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے دہلی آنے کا سنہ ۱۹۰۸ء ہے۔ (تاثرات، ص ۴۶) اس تسامح اور ماہ نامہ نظام المشائخ کی کمیابی کی وجہ سے ہم کو اس خطبہ کو تلاش کرنے میں سالوں لگ گئے۔ یہ خطبہ نظام المشائخ دہلی جنوری ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔ نائب مدیر سید محمد ارتضی معروف بہ ملا واحدی [۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] نے اس پر ایک نوٹ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جب حلقہ میں تصوف کے مضمون پر مولانا شبلی نے تقریر کرنی منظور کر لی تو دہلی میں اس کا اشتہار تقسیم کیا گیا۔ جس میں مولانا کے اس موضوع تقریر کو عارفانہ لکچر کے لفظ سے ظاہر کیا گیا تھا۔ مولانا نے تقریر کی تمہید میں اس لفظ کو بے جوڑ بتایا کہ عارفانہ کے ساتھ لکچر موزوں نہیں۔ جب مولانا بیان ختم کر چکے تو حضرت مدیر اعلیٰ مولانا خواجہ حسن نظامی نے تقریر پر اظہار رائے کرتے ہوئے مولانا کو چودہویں صدی کے شبلی سے یاد کیا۔ گویا عارفانہ لکچر کے لفظ کو اس لطیف طریقہ سے درست کر دیا، یعنی نام اور کلام کے اعتبار سے یہ بیان عارفانہ بیان تھا، مگر چودہویں صدی کے طرز ادا کے سبب اس کا

موزوں نام لکچر ہی ہوسکتا تھا۔

ہم نے بھی اس تقریر کا عنوان عارفانہ لکچر مذکورہ وجہ سے رکھ دیا ہے۔ خدا تعالی وہ دن جلد لائے کہ ہمارے نامور اور مایہ ناز علامہ شبلی نعمانی اسم بامسمی شبلی وقت مانے جائیں اور قال کے ساتھ حال کا صیغہ بھی ان کے ارشاد میں پیدا ہو جائے۔ اس وقت عارفانہ لکچر کی بجائے عارفانہ خطبہ کے لفظ کو استعمال کرنا ضروری سمجھیں گے۔''

(ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، ذی الحجہ ۱۳۲۷ء، مطابق جنوری ۱۹۱۰ء، ص۲)

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو گھنٹے کا یہ طویل خطبہ مکمل نقل نہیں کیا جاسکا ہے جیسا کہ ملا واحدی نے اپنے تمہیدی نوٹ میں بھی لکھا ہے۔ (ایضاً ص۱) جن تین اشخاص کو اس خطبہ کے نقل کرنے پر مامور کیا گیا تھا، اس میں ایک ضیاء الدین احمد برنی [۱۸۹۰-۱۹۶۹ء] بھی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''عظمت رفتہ'' میں علامہ شبلی کے اس خطاب کی روداد لکھی ہے۔ (عظمت رفتہ ص ۲۶۶-۲۷۵)

بہرحال تصوف کے موضوع پر علامہ شبلی کا یہ ایک انتہائی اہم اور منفرد خطبہ ہے۔ جو اس کتاب کی وقعت میں بے حد اضافہ کا باعث ہے۔

بارھواں خطبہ: جبری تعلیم بل

۱۶/ مارچ ۱۹۱۱ء کو گوپال کرشن گوکھلے [۱۸۶۶-۱۹۱۵ء] نے ابتدائی مفت لازمی تعلیم کا بل امپیریل کونسل میں پیش کیا تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ بل تھا جو اگرچہ کونسل سے پاس نہیں ہوا، تاہم انگریزی حکومت نے بعد میں اس سلسلہ میں ان کی امداد کی۔ ۱۹۱۱ء کے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جو دہلی میں منعقد ہوا تھا مولانا محمد علی جوہر جبری تعلیم کو مسلمانوں میں رائج کرنے کے لئے ایک رزولیشن پیش کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اس پر غور و خوض اور بحث و مباحثہ ہو اور اسے منظور کیا جائے۔ نواب وقار الملک نے اس قرارداد

کی مخالفت میں تقریر کی اور اسے نامنظور کرنے کی شفارس کی۔انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں متعدد دلائل بھی دئے۔ان کے بعد علامہ شبلی نے مولانا محمد علی جوہر کے رزولیشن کی تائید وحمایت میں تقریر کی اور نواب وقارالملک بہادر کی تقریر اور ان کے دلائل کی کمزوری دکھائی۔ان کے خلاف علامہ شبلی نے جو باتیں کہیں اس میں ان کا لب ولہجہ اگرچہ ترش تھا، تاہم بچوں کی ابتدائی جبری تعلیم کے موضوع پر علامہ شبلی کی یہ تقریر اور مولانا محمد علی جوہر کی حمایت بے حد اہمیت کی حامل ہے۔اس تقریر سے ابتدائی لازمی تعلیم کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی کا موقف سامنے آتا ہے۔ان کی یہ تقریر بھی خطبات شبلی میں شامل نہیں ہے۔

تیرھواں خطبہ: عورت اور اسلام

یہ خطبہ بھی ان کے مجموعہ خطبات میں شامل نہیں ہے۔راقم کو یہ خطبہ ایک مقالہ کے سلسلہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد ۱۹۱۱ء کی ورق گردانی کرتے ہوئے اتفاقیہ ہاتھ آ گیا تھا۔اسے قدر دانان شبلی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔''

(رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ء ص ۱۶۶-۱۶۹)

علامہ شبلی نے اسلام اور عورت کے متعلق ایک مضمون ماہنامہ الندوہ میں بھی لکھا ہے۔یہ خطبہ اس کے علاوہ ہے۔اور اپنے مشمولات کے لحاظ سے منفرد بھی ہے۔

چودھواں خطبہ : مدرسہ انوارالعلوم حیدرآباد

حیدرآباد سے علامہ شبلی کا بڑا گہرا تعلق تھا۔وہیں کے وظیفہ پر علمی زندگی بسر کی۔چار برس تک سررشتہ علوم وفنون کے ناظم رہے۔دارالعلوم حیدرآباد کے نصاب تعلیم کے لئے انہیں کئی بار ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۹ء میں بلایا گیا۔آخری بار ۱۹۱۳ء میں نصاب تعلیم اور حیدرآباد میں مشرقی علوم کی یونیورسٹی کے قیام کے متعلق ان کی بیش بہا رائے لینے کے مدعو کیا گیا تھا۔اس موقع پر مدرسہ انوارالعلوم محلّہ نامپلی کے بانی مولوی محمد عبدالرزاق صاحب اور صدر مدرس مولوی عبدالرزاق راشد نے مدرسہ کے معائنہ اور طلبہ سے خطاب کے لئے مدعو علامہ شبلی کو

کیا۔ چنانچہ علامہ شبلی وقت مقررہ پرتشریف لے گئے۔ مدرسہ کا معائنہ کیا اورطلبہ واساتذہ اورحاضرین سے خطاب بھی کیا۔اس خطبہ کا خلاصہ اور جلسہ کی روداد مولانا عبدالرزاق راشد نے ''اصلاحات غالب'' میں نقل کی ہے۔ہم نے چودہواں خطبہ وہیں سے نقل کیا ہے۔

خطبات شبلی مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی کی طرح اسے بھی دارالمصنّفین ہی کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے۔اوراسے نودریافت کا نام دیا گیا ہے۔

ان خطبات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے دائرہ عظمت وجامعیت میں ان کی خطابت بھی شامل ہیں۔ زیرنظر مجموعہ خطبات میں ان کے چند بہترین خطبات شامل ہیں۔مطالعہ شبلی کے ایک طالب علم کو یہ خطبات خاصا متاثر کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسے منظرعام پر لایا جارہا ہے۔یوں بھی علامہ شبلی کی ہرتحریروتقریر ہمارے جذبہ شوق کا سامان ہے۔

اس کی ترتیب واشاعت سے خصوصی دلچسپی کے لئے میں استاذ گرامی ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی صاحب جوائنٹ سکریٹری دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا خاص طور پرشکرگذار ہوں۔ان خطبات کی فراہمی میں بھی ہمارے دوست ڈاکٹرعطا خورشید صاحب نے ہمارا تعاون کیا۔میں ان کا بے حدشکرگذار ہوں۔ برادرم مولانا عرفات اعجاز اعظمی نے حسب معمول دلچسپی لی اوراہتمام سے اشاریہ تیار کیا،جس سے کتاب کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے۔میں ان کا بھی شکرگذار ہوں۔

میں اپنے قارئین کا بھی شکرگذار ہوں جوعلامہ شبلی اور مطالعات شبلی سے اپنی دلچسپی کا اظہار نئی مطبوعات کے بارے میں دریافت کرکے حوصلہ بڑھا دیتے ہیں۔

ناچیز

محمدالیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

۲۳رستمبر۲۰۲۱ء

○○○

[۱]

تہنیت

آج میں گورنمنٹ کا ضرور ممنونِ احسان ہوں، مگر گورنمنٹ کا احسان آج کے موقع پر کچھ زیادہ ذکر کرنے کے لائق نہیں۔ کیوں کہ میرا یقین ہے کہ گورنمنٹ نے ہمیشہ نہایت راستی سے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ جب ہم لوگ کسی منصب کی لیاقت پیدا کریں گے تو وہ کبھی ہم کو اس سے محروم نہ رکھے گی۔ پس اس کا یہ احسان ہمیشہ سے ہے اور اس نے کوئی نئی حالت نہیں پیدا کی ہے۔ میں آج اس بات کا زیادہ ذکر کروں گا کہ مسلمانوں نے وہ لیاقت پیدا کر لی ہے، جس کے مدتوں سے منتظر تھے اور اس لئے میں اس نامور شخص سید محمود (۱) کو مبارک باد دوں گا اور حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کا شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے سید صاحب کی لیاقت کا پورا پورا اندازہ کیا اور جو منصب کہ ان کے شایان شان تھا، ان کو عطا فرمایا۔ گو مجھ کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور ان کا بخت خفتہ اب کروٹیں لینے لگا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اب بھی بہت سے مسلمان اپنے کہنہ خیالات کی گہری تاریکی سے نہیں نکلے اور ہنوز وہ بے ہودہ تقلید اور راہ و رسم عام سے وابستہ ہیں۔ گورنمنٹ نے ان کو ترقی کے زینہ تک پہنچا ہی نہیں دیا تھا بلکہ اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کو اوپر لینا چاہا، مگر وہ اپنے انہیں بے ہودہ خیالات کے دباؤ سے جگہ سے ہل بھی نہ سکے۔ سید محمود صاحب ہی مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس بات کو نہ صرف خیالی بلکہ عملی

طریقہ میں ثابت کر دکھایا کہ مسلمانوں کی ترقی اب ان کے ہاتھ میں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ سید محمود صاحب کی تقرری سے ترقی کا جو خیال مسلمانوں کے رگ وریشہ میں دوڑ گیا ہے اور جس قدر کہ اس موجودہ نتیجہ کو دیکھ کر وہ میدان ترقی میں نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ جانے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس قدر تحریک ان مجلسوں اور سوسائٹیوں سے بھی نہیں حاصل ہوئی ہے جو اس وقت تک اس غرض کے لئے گورنمنٹ یا مصلحانِ قوم کی طرف سے منعقد ہوتی رہی ہیں۔ اگر گورنمنٹ کا بھی تقرری سے یہی مقصود ہے تو غالباً کوئی دوسری پالیسی اس کی ہم سری نہیں کر سکتی اور یقیناً مسلمانوں کے مردہ اور افسردہ دلوں کے ابھارنے کے لئے اس سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہے۔ مسلمان تو جہالت میں لمبی نیند لے رہے ہیں۔ یہ توقع کہ وہ ایک خفیف تحریک سے بیدار ہو جاویں گے، بالکل بے سود ہے۔ سید محمود کی تقرری میں اکبر(۲) کی پالیسی کی چمک بھی موجود ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ پولیٹیکل معاملات کے قصر عالی شان کی بنا ہندوستانی ارکان پر قائم کی جاوے۔ خوشامد اور بات ہے، مگر ممالک مغربی و شمالی کے عام باشندے اس بات کو ضرور حسرت وافسوس کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ جس مجموعی جلسہ کے ہاتھ میں لاکھوں کی جانیں ہوں، ان میں ہماری قوم کا ایک شخص بھی نہ موجود ہو۔ اس امر کی نسبت ایک مطبعانہ شکایت ضرور دلوں میں بلکہ بعض زبانوں پر بھی موجود تھی۔ سید محمود کی تقرری سے صرف یہی مطلب نہیں پورا ہوا بلکہ خاص مسلمانوں کی ایک دوسری شکایت کا سدباب بھی ہو گیا۔ جیسا کہ مسلمانان کلکتہ (۳) کی عرض داشت میں ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمان اس بات کو بھی دل میں رکھتے تھے کہ مقدمات شرعیہ میں پوری تحقیقی موشگافی صرف ایک مسلمان شخص ہی سے ممکن ہے۔ پس سید محمود کی تقرری صرف ایک خیالی خوشی کا باعث نہیں ہے بلکہ اس کا اثر واقعات پر بھی ایک وسیع اور معتد بہ اثر ہے۔ اخیر میں اپنے بیان کو ان فقروں پر ختم کروں گا:

''سید محمود تو مبارک، تجھ کو تیرا عہدہ مبارک، تو اپنے کو ایسا

ثابت کر کہ گورنمنٹ تجھ سے بہتر کوئی شخص انتخاب نہ کر سکے۔ دیکھ ہوشیار رہ تیری رفتار میں لغزش نہ آئے۔ تجھ پر ہزاروں کی نگاہیں بلند رہیں۔'' (۴)

تعلیقات و حواشی

(۱) جسٹس سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء]، سرسید کے صاحبزادے تھے۔ کوئنس کالج بنارس میں تعلیم پائی ۱۸۵۹ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ ۱۸۷۳ء میں قانون کی تعلیم مکمل کی۔ پہلے ڈسٹرکٹ جج پھر ہائی کورٹ الہ آباد کے جج مقرر ہوئے۔ اس موقع پر اعظم گڑھ میں مبارک باد پیش کرنے کے لئے علامہ شبلی نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسہ میں انہوں نے جو تقریر کی تھی وہ ان کی ابتک کی دریافت سب سے قدیم تقریر ہے۔ علامہ شبلی جب علی گڑھ میں پروفیسر ہوئے تو ان سے اچھے مراسم رہے۔ یہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ اور علی گڑھ کالج کے تمام اختیارات کے لئے حصول کی کوشش شروع کی اس زمانہ میں ان سے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ انہیں کی وجہ سے علامہ شبلی کو سرسید کی بنگلیہ چھوڑنی پڑی اور چند دنوں کے لے نواب اسماعیل دتاولی کے گھر رہنا پڑا۔ علی گڑھ کی پروفیسری سے علامہ شبلی نے اپنا استعفیٰ انہی کو مئی ۱۸۹۸ء میں سونپا تھا۔

سرسید کی وفات کے بعد چند ماہ کالج کے سکریٹری رہے لیکن پھر انہیں دست بردار ہونا پڑا اور نواب محسن الملک سکریٹری نامزد ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے وفات پائی۔

(۲) ہندوستان کا نامور بادشاہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر

(۳) مسلمانان کلکتہ کی کس عرض داشت کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس وقت علامہ شبلی نعمانی کی عمر ۲۵ ربرس تھی اور ملک کے مسلمانوں کی سرگرمیوں پر ان کی نگاہ تھی۔

(۴) ماہنامہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۱ء

[۲]

اعلیٰ تعلیم کی ضرورت

یہ رزولیشن متعدد مضامین پر مشتمل ہے اوران کا جداگانہ بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ بات کہ قوم کوانگریزی میں اعلیٰ تعلیم کی نہایت ضرورت ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جو اپنے ثبوت میں دلیل کا بہت کم محتاج ہے۔ظاہر ہے کہ ہماری ملکی ،تمدنی واخلاقی ،غرض ہر ایک طرح کی ترقی انگریزی میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر موقوف ہے۔

اگرآپ اس عجیب اوردردناک انقلاب کوجومسلمانوں کی تاریخی زندگی میں برابر پیدا ہوتا گیاہے، ذرابھی غور کی نگاہ سے دیکھیں گےتوصاف معلوم ہوگا کہ ہماری یہ حالت صرف اس وجہ سے ہے کہ ہماری قوم نے اب تک اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کوبخوبی نہیں سمجھایا اس سے دانستہ بےاعتنائی کی۔

گورنمنٹ کے صیغۂ ملازمت میں ہمارابہت کم حصہ ہے۔ہم اپنے حقوق کے ظاہر کرنے کا کوئی معقول ذریعہ نہیں رکھتے۔ ہماراکوئی قومی اخبارنہیں ہے جوگورنمنٹ کی زبان میں گورنمنٹ کوہمارے مقاصد سے مطلع کرے۔لیکن جب پوچھا جائے کہ ایسا کیوں ہےتو یہی ایک جواب ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نہ ہونے سے۔

ہماری سوشل اور مارل زندگی بھی بالکل بےترتیب ہے۔ ہرایک قوم میں جس کو حکومت کے ساتھ کچھ امتداد حاصل ہو، اس کے علوم اورخاندانی روایتوں کی بناپراخلاق اور

معاشرت کا ایک بااصول سلسلہ تیار ہو جاتا ہے اور اسی لحاظ سے ہماری قوم کے پاس بھی جو ایک مدت تک تیغ و قلم دونوں کی مالک تھی، ایک مجموعۂ اخلاق موجود تھا۔ لیکن اس عام قاعدہ کے موافق کہ جب کسی قوم کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہتی ہے تو اس کے اخلاق و معاشرت پر بھی زوال آجاتا ہے۔ ہماری قوم کی اخلاقی زندگی بالکل بے ترتیب ہوگئی ہے۔ اب اگر ہم اس کے اصلاح کی فکر کی طرف مائل نہ ہوں تو ضرور ہے کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کریں اور وہی سچائی، آزادی، دلیری، بلند ہمتی، اوقات کی پابندی، محنت شعاری سیکھیں جو مغربی تعلیم کا ایک لازمی اثر ہے۔ ایشیائی بگڑے ہوئے اخلاق اسی تعلیم سے دور ہو سکتے ہیں، لیکن میری مراد اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہے نہ کہ ادنیٰ درجہ کی تعلیم، جس سے ہم نہ ادھر کے رہیں نہ ادھر کے۔

علمی ترقی جو زندگی کا اصل مقصد ہے، وہ یورپین اعلیٰ تعلیم پر موقوف ہے۔ یورپ میں علوم و فنون کو جو ترقی حاصل ہے، اس کے سامنے پچھلی ترقیوں کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ زمانہ نے ہزاروں مسئلے علوم کے تعلق سے پیدا کر دئے اور جو قدیم مسائل تھے ان کو جلا دی۔ ایسی حالت میں ہماری علمی ترقی کے لئے صرف مشرقی زبانیں کافی نہیں ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ نہایت وسعت کے ساتھ قوم میں اعلیٰ تعلیم پھیلے۔ قوم میں اعلی تعلیم کے شائع ہونے کی جو ضرورت ہے، اس میں گورنمنٹ کا بھی حصہ ہے اور یہ دعویٰ ہمارے رزولیشن کا ایک اصلی اور ضروری ٹکڑا ہے۔

جو گورنمنٹ ہماری تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار ہے، جس نے ہمارے امن و آرام کے لئے سڑکیں، ریل، تار، نہریں، شفاخانے قائم کئے ہیں، کیا اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ ہمارے دماغ کو بھی پوری ترقی دے؟ جو صرف اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہو سکتی ہے۔ ملک کا اور گورنمنٹ کو اسی میں فائدہ ہے کہ ملک میں اعلی درجہ کی تعلیم مغربی رواج پاوے۔ گورنمنٹ کا یہی فرض ہے اور اس کو یہی کرنا چاہئے۔ مشرقی زبان سیکھنے کی ہم کو ضرورت

ہے۔مگراس ضرورت کے مقدار کو ہم خود سمجھ سکتے ہیں اور جس کی نسبت ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی حاصل کرنے والے کے لئے بطور سکنڈ لینگویج کے پڑھنا کافی ہے۔ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ مشرقی علوم (جس کے یاد کرنے سے ہمارے دلوں میں اب بھی ایک حسرت آمیز جوش پیدا ہوتا ہے،) کے ساتھ گورنمنٹ کی ہمدردی، ہماری ہمدردی سے زیادہ ہوسکتی ہے۔قوم کے وہ اشخاص جو انگریزی تعلیم سے الگ رہنا چاہتے ہیں اور واقعات نے ان کو اس تعلیم سے روک دیا ہے، ان کو بے شبہ مشرقی اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔مگر اس کے قیام کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔گورنمنٹ سے اس کو کچھ تعلق نہیں ہے۔گورنمنٹ ہم کو اس معاملہ میں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔مشرقی علوم کی ترتیب اور طرز تعلیم سے گورنمنٹ بہت کم واقف ہے۔اور جس واقفیت کا اس کو دعویٰ ہے اس پر ان لوگوں کو اطمینان نہیں ہے جو مشرقی تعلیم کے خواہاں ہیں۔

گورنمنٹ جن لوگوں کو بہت بڑا ادیب اور فاضل سمجھ کر اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بیش قرار تنخواہوں پر مقرر کرتی ہے، مشرقی تعلیم کے خواہاں ان کی عزت ایک طالب علم کے برابر نہیں کرتے۔مشرقی تعلیم کی اسکیم انگریزی تعلیم سے بالکل الگ ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ مشرقی علوم کو انگریزی کالجوں کے احاطہ میں ڈھونڈنا بالکل بے فائدہ ہے۔انگریزی کالجوں پر موقوف نہیں اسلامی مدارس بھی جو ایک خاص پابندی کے ساتھ کسی زمانہ میں قائم تھے علوم مشرقی کے لئے چنداں مفید نہ تھے۔مسلمانوں میں جو بڑے بڑے فلاسفر، حکیم، محقق اور امام گذرے ہیں۔انہوں نے مدرسوں میں تعلیم نہیں پائی تھی۔وہ سب خانگی تعلیم کے ذریعے سے اس رتبہ پر پہنچے تھے۔

گورنمنٹ اگر مشرقی تعلیم اپنے ہاتھ میں لے تو اس کو ایک اور مشکل کا سامنا ہوگا۔ مشرقی تعلیم مذہبی تعلیم کے ساتھ ایسی مخلوط ہوگئی ہے کہ اگر اس سے جدا کردی جائے تو مشرقی علوم بے اثر اور کم وقعت رہ جائیں گے۔مسلمانوں میں علوم ہمیشہ مذہب کے ماتحت رہے۔

غزالی (۱)، فخر رازی (۲)، طوسی (۳) جن کو یورپ کے لوگ فلاسفر کہتے ہیں، وہ ہماری قوم میں زیادہ تر اس وجہ سے عزت رکھتے تھے کہ ان کو پیشوائے مذہبی بھی مانا گیا تھا۔ مذہبی علماء قوم پر ایک پولٹیکل اثر رکھتے تھے اور عام لوگ ان کو اپنا مذہبی اور اخلاقی حکمراں خیال کرتے تھے۔ مشرقی تعلیم کی طرف میلان عام کے یہ اسباب تھے۔ اب اگر اس سلسلہ میں سے مذہبی تعلیم جو درحقیقت مشرقی علوم کی جان ہے، نکال دی جائے تو مسلمان اس کی کچھ قدر نہ کریں گے۔ پس گورنمنٹ جس طرح پر کہ مشرقی علوم کی تعلیم دینا چاہتی ہے اور جس طریقہ پر کہ وہ دے سکتی ہے، وہ درحقیقت مشرقی علوم کی تعلیم نہیں ہے اور نہ ان لوگوں پر کچھ احسان ہے جو ایسی تعلیم کے خواہاں ہیں۔ گورنمنٹ کو اس معاملہ میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اس کا فرض یورپین تعلیم کو نہایت اعلیٰ درجہ تک پہنچانا چاہئے۔ غالباً میں نے اس رزولیشن کے ہر ایک پہلو پر بحث کی ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ وہ کمیٹی کی عام رائے سے پاس کیا جاوے۔'' (۴)

تعلیقات و حواشی

(۱) ابو حامد محمد بن محمد غزالی [۱۰۵۸-۱۱۱۱ء] ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ وہ نہ صرف فلسفہ میں بے نظیر تھے بلکہ حکمت کے ساتھ علوم اسلامی، فقہ، علم الکلام کے بھی نادرہ عصر عالم و محقق تھے۔ ''احیاء علوم الدین''، ''تہافتہ الفلاسفہ'' اور ''کیمیائے سعادت'' ان کی عالم گیر شہرت یافتہ تصنیفات ہیں۔ چونکہ انہوں نے اسماعیلیوں اور نوافلاطونیوں کے بڑے مدلل اور مسکت جوابات دئے اس لئے انہیں ''حجۃ الاسلام'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

وہ ایران کے شہر طوس میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی عظمت و شہرت ایران سے نکل کر یورپ تک جا پہنچی اور یورپ ایک عرصہ تک ان کی کتابیں اور ان کے علوم پڑھتا پڑھاتا رہا۔ علامہ شبلی نے اپنے ایک قصیدہ میں جو ۱۸۹۴ء میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں جہاں مسلمانوں کی علمی ترقی و

برتری اور فضیلت کا ذکر کیا ہے، وہاں اور بہت سے مشاہیر اسلام کے ساتھ امام غزالیؒ کے علوئے مرتبہ کو بھی بیان کیا ہے۔(کلیات شبلی اردو ص:۷۷)

امام غزالیؒ کے مفصل ذکر کے لئے علامہ شبلی کی معرکتہ الآرا کتاب ''الغزالی''مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) امام فخر الدین رازی[۱۲۰۹-۱۲۴۹ء] ایران کے شہر رے میں پیدا ہوئے۔دینی علوم اور شعر و ادب کی تحصیل کے بعد خوارزم گئے۔معتزلہ سے مناظروں کی وجہ سے ملک چھوڑنا پڑا۔پھر ماوراء النہر گئے وہاں بھی مخالفت ہوئی تو رے واپس آ گئے۔غوری سلطان شہاب الدین غوری سے تعلقات قائم ہوئے تو اس نے اعزاز و اکرام اور دولت سے نوازا۔بعد ازاں علاء الدین خوارزم شاہ نے بھی بڑا اعزاز کیا۔چنانچہ عرصہ تک وہ خراسان میں مقیم رہے۔پھر انہوں نے بخارا، ہرات، سمرقند اور ہندوستان کے سفر کئے اور آخر میں ہرات میں سکونت اختیار کی۔یہاں وہ شیخ الاسلام کے لقب سے نوازے گئے۔مختلف علوم وفنون میں درک حاصل تھا۔مفسر، ماہر فلسفہ و علم الکلام تھے۔اور ایک بڑے مصنف تھے۔متعدد تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ان میں تفسیر مفاتیح الغیب، المباحث، محصل افکار المتقدمین والمتاخرین اور شرح اشارات بوعلی سینا بہت مشہور ہیں۔

(۳) خواجہ نصیر الدین طوسی۔محقق طوسی کے نام سے مشہور ہے۔بمقام طوس ۱۸؍فروری ۱۲۰۱ء میں پیدا ہوا۔وہیں تحصیل علم کیا۔ریاضی اور علم نجوم میں بڑی مہارت حاصل کی۔اسماعیلی شیعہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ محتشم ناصر الدین کے دربار سے وابستہ ہوا اور اسی کے نام پر ''اخلاق ناصری''لکھی۔ایک بڑا مصنف و محقق تھا اور متعدد کتابیں اس کے قلم سے نکلیں۔تحریر اقلیدس، تحریر مجسطی، شرح اشارات بوعلی، اساس الاقتباس، اوصاف الاشراف، سی فصل، معیار الاشعار تذکرۃ الناصر کے نام ملتے ہیں۔طوسی برسوں ہلاکو خاں کے ساتھ رہا اور اس کی مدد کی۔چنانچہ ہلاکو نے ان کی سرپرستی میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی۔۲۶؍جون ۱۲۷۴ء میں بغداد میں وفات پائی۔

(۴) روداد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۷؍دسمبر ۱۸۸۶ء، بحوالہ باقیات شبلی ص ۲۹ - ۳۴

[۳]

مغربی علوم وفنون

اے معزز صاحبان جلسہ

مجھے اس بات کی عزت دی گئی ہے کہ اس قومی تعلیمی کانگریس میں جو ہماری عام ضرورتوں کے لئے قائم ہوئی ہے ایک رزولیشن پیش کروں جو حسب مندرجہ ذیل ہے۔

اس جلسہ کی رائے میں مسلمانوں کو مغربی علوم اور انگریزی زبان دانی میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔قوم اور گورنمنٹ دونوں کو اس پر توجہ کرنی چاہئے۔ انگریزی کالجوں میں مشرقی زبان کا بطور سیکنڈ لینگوج یعنی دوسری زبان کے رہنا کافی ہے۔ خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ درکار نہیں ہے۔ وہ جس طرح کہ ہمارے قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے عالموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے، اس کو اسی طور پر رہنا چاہئے اور خود ہماری قوم کو اس کے باقی اور قائم رہنے پر ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہیں توجہ رکھنی لازم ہے۔ مشرقی علوم جو مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہوسکتے اور اس لئے گورنمنٹ کو اس کا اختیار کرنا مناسب نہیں ہے اور اگر مذہبی مسائل کو اس سے خارج رکھا جاوے تو کوئی شخص جو مشرقی علم کا خواہاں ہے اس کو پسند نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے اس کو اختیار کرے گا تو مسلمان کمیونٹی میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔

یہ رزولیوشن چند معتمد اور خاص مضامین پر مشتمل ہے اوران کا جداگانہ بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

یہ بات کہ ''قوم کوانگریزی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی نہایت ضرورت ہے۔'' ایک ایسا دعویٰ ہے جو اپنے ثبوت میں دلیل کا بہت کم محتاج ہے۔ظاہر ہے کہ ہماری ملکی ،قومی واخلاقی ، غرض ہرایک طرح کی ترقی انگریزی اعلی درجہ کی تعلیم پر موقوف ہے۔

اگرآپ اس عجیب اوردردناک انقلاب کوجومسلمانوں کی تاریخ زندگی میں برابر پیدا ہوتا گیاہے ذرا بھی غور کی نگاہ سے دیکھیں گے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہماری یہ حالت صرف اس وجہ سے ہے کہ ہماری قوم نے ابتک اعلی تعلیم کی ضرورتوں کو بخوبی سمجھانہیں یااس سے دانستہ بے اعتنائی کی۔

گورنمنٹ کے صیغۂ ملازمت میں ہمارا بہت کم حصہ ہے۔ہم اپنے حقوق کے ظاہر کرنے کا کوئی معقول ذریعہ نہیں رکھتے۔ ہمارا کوئی قومی اخبار نہیں ہے جو گورنمنٹ کی زبان میں گورنمنٹ کو ہمارے مقاصد سے مطلع کرے۔لیکن جب یہ پوچھا جائے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو یہی ایک جواب ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نہ ہونے سے۔

ہماری سوشل اور مارل زندگی بھی بالکل بے ترتیب ہے۔ ہرایک قوم میں جس کو حکومت کے ساتھ کچھ امتدادا حاصل ہواس کے علوم اور خاندانی روایتوں کی بناپراخلاق اور معاشرت کا ایک بااصول سلسلہ تیار ہو جاتا ہے اوراسی لحاظ سے ہماری قوم کے پاس بھی جو ایک مدت تک تیغ وقلم دونوں کے مالک تھے، ایک مجموعۂ اخلاق موجود تھا،لیکن اس عام قاعدہ کے موافق کہ ''جب کسی قوم کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہتی ہے تو اس کے اخلاق و معاشرت پر بھی زوال آجاتا ہے۔'' ہماری قوم کی اخلاقی زندگی بالکل بے ترتیب ہوگئی ہے۔ اگر ہم اس کے اصلاح کی فکر کی طرف مائل ہوں تو ضرور ہے کہ ہم اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کریں۔اور وہی سچائی ،آزادی، دلیری، بلند ہمتی، اوقات کی پابندی، محنت شعاری

سیکھیں جو مغربی تعلیم کا ایک لازمی اثر ہے۔ ایشیائی بگڑے ہوئے اخلاق اسی تعلیم سے دور ہو سکتے ہیں۔ لیکن میری مراد اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہے۔ نہ وہ ادنیٰ درجہ کی تعلیم جس سے ہم نہ ادھر کے رہیں نہ ادھر کے۔

علمی ترقی جو زندگی کا اصل مقصد ہے وہ یہی یورپین اعلیٰ تعلیم پر موقوف ہے۔ یورپ میں علوم وفنون کو جو ترقی حاصل ہے اس کے سامنے پچھلی ترقیوں کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ زمانے نے ہزاروں مسئلے علوم کے تعلق سے پیدا کر دئے اور جو قدیم مسائل تھے ان کو جلا دیدی۔ ایسی حالت میں ہماری علمی ترقی کے لئے صرف مشرقی زبانیں کافی نہیں ہیں۔ اور ضرور ہے کہ نہایت وسعت کے ساتھ قوم میں اعلیٰ تعلیم پھیلے۔

قوم میں اعلیٰ تعلیم کے شائع ہونے کی جو ضرورت ہے اس میں گورنمنٹ کا بھی حصہ ہے۔ اور یہ دعوی ہمارے رزولیوشن کا ایک اصلی اور ضروری ٹکڑا ہے۔

جو گورنمنٹ ہماری تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار ہے، جس نے ہمارے امن کے لئے سڑکیں، ریل، تار، شفاخانے قائم کئے ہیں، کیا اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ ہمارے دماغ کو بھی پوری ترقی دے جو صرف اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہو سکتی ہے۔

ملک کا اور گورنمنٹ کا اسی میں فائدہ ہے کہ ملک میں اعلی درجہ کی تعلیم مغربی رواج پائے۔ گورنمنٹ کا بھی فرض ہے اور اس کو یہی کرنا چاہئے۔ مشرقی علوم کا زندہ کرنا نہ ہمارے لئے مفید ہے۔ نہ گورنمنٹ کا فرض ہے۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ مشرقی زبان کے سیکھنے کی ہم کو ضرورت ہے، مگر اس ضرورت کا مقدار ہم خود سمجھ سکتے ہیں اور جس کی نسبت ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی حاصل کرنے والے کے لئے بطور سکنڈ لینگوج کے پڑھنا کافی ہے۔ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ مشرقی علوم (جس کے یاد کرنے سے ہمارے دلوں میں اب بھی ایک حسرت آمیز جوش پیدا ہوتا ہے) کے ساتھ گورنمنٹ کی ہمدردی، ہماری ہمدردی سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ قوم کے وہ اشخاص جو انگریزی تعلیم سے الگ رہنا

چاہتے ہیں، اور واقعات نے بھی ان کو اس تعلیم سے روک دیا ہے ان کو بے شبہ مشرقی اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ اور اس کے قیام کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ گورنمنٹ سے اس کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ گورنمنٹ ہم کو اس معاملہ میں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ مشرقی علوم کی ترتیب اور طرز تعلیم سے گورنمنٹ بہت کم واقف ہے۔ اور جس واقفیت کا اس کو دعوی ہے اس پر ان لوگوں کو اطمینان نہیں ہے، جو مشرقی زبان کے خواہاں ہیں۔ گورنمنٹ جن لوگوں کو بہت بڑا ادیب اور فاضل سمجھ کر اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بیش قرار تنخواہوں پر مقرر کرتی ہے، مشرقی تعلیم کے خواہاں ان کی عزت ایک طالب العلم کے برابر بھی نہیں کرتے۔ مشرقی تعلیم کی اسکیم انگریزی تعلیم سے بالکل الگ ہے۔ اور بالکل سچ ہے کہ مشرقی علوم کو انگریزی کالجوں کے احاطہ میں ڈھونڈھنا بالکل بے فائدہ ہے۔ انگریزی کالجوں پر موقوف نہیں اسلامی مدارس بھی جو ایک خاص پابندی کے ساتھ کسی زمانہ میں قائم تھے، علوم مشرقی کے لئے چنداں مفید نہ تھے۔ مسلمانوں میں جو بڑے بڑے فلاسفر، حکیم، محقق، امام گذرے ہیں انہوں نے مدرسوں میں تعلیم نہیں پائی تھی، وہ سب خانگی تعلیم کے ذریعہ سے اس رتبہ پر پہنچے تھے۔

گورنمنٹ اگر مشرقی تعلیم اپنے ہاتھ لے تو اس کو ایک اور مشکل کا سامنا ہوگا۔ مشرقی تعلیم مذہبی تعلیم کے ساتھ ایسی مخلوط ہوگئی ہے کہ اگر اس سے جدا کر دی جاوے تو مشرقی علوم بالکل بے اثر اور کم وقعت رہ جاویں۔ مسلمانوں میں علوم ہمیشہ مذہب کے ماتحت رہے ہیں۔ غزالی، فخر رازی، طوسی ان کو یورپ کے لوگ فلاسفر کہتے ہیں وہ ہماری قوم میں زیادہ تر اس وجہ سے عزت رکھتے تھے کہ ان کو پیشوائے مذہبی بھی مانا گیا تھا۔ مذہبی علماء قوم پر ایک اثر رکھتے تھے اور عام لوگ ان کو اپنا مذہبی اور اخلاقی حکمراں خیال کرتے تھے۔ مشرقی تعلیم کی طرف میلان عام کے یہ اسباب تھے۔

اب اگر اس سلسلہ میں سے مذہبی تعلیم جو درحقیقت مشرقی علوم کی جان ہے، نکال

دی جاوے تو مسلمان اس کی کچھ قدر نہ کریں گے۔

پس گورنمنٹ جس طرح پر کہ مشرقی علوم کی تعلیم دینا چاہتی ہے اور جس طریقہ پر کہ وہ دے سکتی ہے وہ درحقیقت مشرقی علوم کی تعلیم نہیں ہے۔ اور نہ ان لوگوں پر کچھ احسان ہے جو ایسی تعلیم کے خواہاں ہیں۔ گورنمنٹ کو اس معاملہ میں نہیں پڑنا چاہیئے اور اس کا فرض صرف یوروپین تعلیم کو نہایت اعلی درجہ تک پہونچانا ہے۔

غالبًا میں نے اس رزولیوشن کے ہر ایک پہلو پر بحث کی ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ وہ کمیٹی کی عام رائے سے پاس کیا جاوے۔

[محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۷ ر دسمبر ۱۸۸۶ء، ص ۲۴ -۲۸]

نوٹ:

علامہ شبلی کے رزولیشن کی تائید بانی کانفرنس سر سید احمد خاں نے کی۔ اور نہ صرف تائید کی بلکہ مزید دلائل سے اس کی اہمیت اور افادیت ثابت کی۔ افادیت ہی کے پیش نظر اسے یہاں درج کیا جاتا ہے:

سر سید کی تائیدی تقریر

میں اس رزولیوشن کے پاس ہونے کی تائید کرتا ہوں۔ کیا اب بھی کسی کو اس بات میں شبہہ باقی ہے کہ ہماری قوم کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہائی انگلش ایجوکیشن ہے سوائے ان چند پرانے خیال کے لوگوں کے جن کی تعداد کئی ہزار درجہ ان سے بھی کم ہے جو اب تک سورج کے زمین کے گرد گھومنے پر یقین کرتے ہیں اور جو دراصل انگلش تعلیم ہی کو ناجائز سمجھتے ہیں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ہائی انگلش ایجوکیشن کا خواہش مند نہ ہو۔ درحقیقت ہندوستان میں اب تک ہائی ایجوکیشن کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہماری

یونیورسٹیوں نے ہم کو اب تک صرف ہائی ایجوکیشن کے دروازہ تک پہونچایا ہے مگر اس کے اندر جانے کا رستہ بند کر رکھا ہے۔ انسان کی تعلیم عمدہ حالت ہونے کو یہ بات لازم ہے کہ وہ ہر فن میں کچھ کچھ جانتا ہو اور ایک میں کامل ہو۔ مگر ہندوستان کے کالج اور ہماری یونیورسٹیاں ہم کو کچھ کچھ سکھلاتی ہیں اور کسی ایک میں کامل نہیں کرتیں۔ ہم کو ہندوستان کے کالجوں سے خواہ وہ گورنمنٹ کے کالج ہوں یا پرائیویٹ جو شکایت ہے وہ ہائی ایجوکیشن کے نہ ہونے کی ہے پس اگر موجودہ ایجوکیشن تک بھی ہماری رسائی نہ ہو جس کا نام غلطی سے ہائی ایجوکیشن رکھا ہے تو میں نہیں خیال کر سکتا کہ ہماری تعلیم کس درجہ تک خراب حالت میں پہونچ جائے گی۔

یہ میری رائے کوئی نئی رائے نہیں ہے۔ ۱۸۶۹ء میں جبکہ میں لندن میں تھا میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ ہندوستان کی تعلیم پر لکھا تھا اس کا ایک فقرہ اس مقام پر نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ میں نے لکھا تھا کہ ''سرکار انگریزی نے ہندوستان میں دو نہایت بڑے کام کئے ہیں مگر ایک کام دوسرے کا متناقض ہے۔ اول تو گورنمنٹ نے نہایت فیاضی سے اقرار کیا کہ اس کی تمام رعایا کے حقوق خواہ وہ رعایا ہندوستانی ہو یا انگریزی ہر اعتبار سے برابر ہوں گے دوم گورنمنٹ نے ہم کو ہماری زبان مادری اور ہمارے موروثی علوم سے محروم کر دیا اور ہم کو انگریزی زبان اور یورپین سائنس کے سیکھنے کو مجبور کیا۔ اب دوسری بات کا نتیجہ تو یہ ہے کہ گورنمنٹ پر یہ فرض ہو گیا کہ ہندوستانیوں کو زبان و علوم مذکورہ سکھاوے اور اقرار جو اس قدر قسمیہ اور عموماً کیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بات گورنمنٹ پر لازمی ہوگئی ہے کہ ہندوستانیوں کو اس درجہ تک تعلیم دے کہ ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جاوے یا یوں کہو کہ وہ اپنے تئیں ایسا لائق کرنے کی کوشش کریں کہ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں وہ بھی پا سکیں۔ اگر گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اس درجہ تک کی تعلیم نہ دے گی تو اس نے اپنے اقرار کو پورا نہیں کیا اور ہندوستانیوں کے حق میں ناانصافی ہوئی کیونکہ وہ بے فائدہ ایسی کشاکش میں چھوڑ دئے گئے کہ جہاں تک ان کو پہونچنا ہے وہاں تک کا رستہ ہی نہیں۔

گورنمنٹ اپنے فرض سے ہرگز بری نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ تعلیم کا کوئی ایسا طریقہ نہ قائم کرے جس سے ہندوستانی نوجوان بیس برس کی عمر میں اور بموجب قواعد حال کے انیس برس کی عمر میں اس قدر قابلیت حاصل کرلیں کہ وہ انگلستان میں جا کر سول سروس کے مقابلہ کا امتحان اپنی ہم پیشہ رعایا انگریزوں کے ساتھ دیں۔ مگر صاحب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک حال کے طریقہ سے ہندوستان میں تعلیم جاری رہے گی ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ہندوستانی لڑکے نہ تو سست ہوتے ہیں اور نہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں قدرتی قابلیتیں نہ ہوں۔ فی الواقع یہ طریقۂ تعلیم ہی کا قصور ہے اگر وہ پوری قابلیت اور علم جو کہ ان میں ہونے چاہئے بیس برس کی عمر میں نہیں حاصل کرسکتے۔''
پس نہ صرف ہم کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کو ہائی انگلش ایجوکیشن کی ضرورت ہے بلکہ گورنمنٹ کو بھی اپنی اقرار پورا کرنے کے لئے ہم کو ہائی انگلش ایجوکیشن تعلیم دینا لازمی ہے۔ گورنمنٹ کا مشرقی علوم کی تعلیم پر برخلاف ہماری خواہشوں کے متوجہ ہونا جس کے ساتھ ہم کو ایک فطرتی طور پر بہ نسبت گورنمنٹ کے زیادہ ہمدردی ہے ایک حیلہ ہماری تعلیم ہائی انگلش ایجوکیشن کو گھٹانے کا یا ہم کو ہمارے حقوق تک پہونچنے کے رستہ کو بند کرنا ہے۔ پس کون شخص ہے کہ جو ضرورت ہم کو ہائی انگلش ایجوکیشن کی ہے اس سے انکار کرسکتا ہے۔

گورنمنٹ کا مشرقی علوم میں ہم کو تعلیم دینا ناممکن ہے جس کی وجہ خود اس رزولیشن میں جو منظوری کو پیش ہوا ہے بیان کی گئی ہے۔ ہاں ہم میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کا مقصد بلا خیال اپنی دنیاوی ترقی کے یا دنیاوی حالت کے صرف علوم مشرقی کا جس میں علم و مذہب دونوں شامل ہیں حاصل کرنا ہے۔ مگر کیا گورنمنٹ اپنے کالجوں میں یا اپنی یونیورسٹیوں میں ان علوم کی ان کو تعلیم دے سکتی ہے ہرگز نہیں۔ لارڈ میکالے کے زمانہ سے پیشتر گورنمنٹ کے کالجوں میں علوم مشرقی کی تعلیم ہوتی تھی پھر کیا گورنمنٹ بتا سکتی ہے کہ اس کے کالجوں

نے کوئی بھی ایسا شخص پیدا کیا تھا جو علوم مشرقی میں عالم کہلانے کا درجہ رکھتا تھا؟ مما لک میں گورنمنٹ کی حکومت کو اسی برس سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا کیا وہ نشان دے سکتی ہے کہ ان لوگوں میں سے جو دن رات نہایت تکلیف اور دقت سے علوم مشرقی کی تحصیل میں مصروف تھے ایک نے بھی گورنمنٹ کے کالجوں سے تعلق پیدا کیا تھا؟ اب بھی وہ لوگ جو اپنے قدیم طریقہ پر علوم مشرقی کی تحصیل میں مصروف ہوں معدوم نہیں ہو گئے ہیں بلکہ ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی اب بھی جا بجا موجود ہے گورنمنٹ کی طاقت سے یہ بات خارج ہے کہ ان میں سے ایک کو بھی اپنے کالجوں یا اپنی یونیورسٹیوں میں گو کہ وہ مشرقی علوم کی ترقی پر کیسی ہی سرگرمی ظاہر کرے شامل کر سکے۔ پس نہ ہم کو اس بات کی حاجت ہے کہ گورنمنٹ علوم مشرقی کی تعلیم پر توجہ کرے اور نہ گورنمنٹ کو مناسب ہے کہ ایسے امر میں جس میں درحقیقت وہ کچھ نہیں کر سکتی دست اندازی کرے۔

ہاں بلاشبہ مشرقی علوم ہمارے موروثی علوم ہیں ہمارے بزرگوں نے ان علوم میں ایسا نام پیدا کیا تھا کہ جب تک دنیا میں ہسٹری قائم ہے اس کے ساتھ ہمارے بزرگوں کا نام بھی قائم ہے۔ یہ فخر کہ ہمارے بزرگوں کے علوم کی بدولت یورپ نے تعلیم پائی ہے کسی کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتا۔ پس خود ہمارا فرض ہے ہم اس فخر کو بھی اپنی قوم میں زندہ رکھیں۔

بے شک ہم کو اس بات پر کوشش کرنی چاہئے کہ جو لوگ بلا خیال اپنی دنیاوی ترقی یا دنیاوی حالت کے صرف علوم مشرقی کی تحصیل میں اپنے قدیم طریقہ سے مصروف ہیں ان میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو قدیم منطق اور فلسفہ میں عربی و فارسی کے علم ادب میں علم شعر و انشاء میں اپنے بزرگوں کی یادگار یا ان کے قائم مقام ہوں اور ہمارے باپ دادا کی ہسٹری ہم کو یاد دلاتے رہیں۔ مگر گورنمنٹ کو ان باتوں سے تعلق رکھنا نہیں چاہئے۔ کیونکہ وہ اس میں بجز اس کے ایک بیفائدہ کام اختیار کرے اور لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ پس مناسب ہے کہ اس امر کو وہ ہم پر چھوڑ دے خواہ ہم اس میں کچھ کریں

اوراپنے بزرگوں کی یادگار قائم رکھیں خواہ کچھ نہ کریں اوراپنے بزرگوں کی یادگار کومٹادیں۔

اے صاحبو! میں نے اس رزولیوشن کے دونوں پہلوؤں کی نسبت صاف بیان کردیا ہے اور مجھ کو امید ہے کہ تمام لوگ جواس وقت جمع ہیں میرے مقصد اور رزولیوشن کے مطلب کوبخوبی سمجھ گئے ہوں گے اوراس کے منظور کرنے پر سب متفق ہوں گے۔

[۴]

اعلیٰ تعلیم یا ادنیٰ تعلیم

جناب پریسڈنٹ وممبران انجمن!

جس رزولیشن کی تحریک کرنے کی میں نے جرات کی ہے، وہ ایک نہایت صاف اور بدیہی رزولیشن ہے، جس کو سکریٹری صاحب نے اجلاس میں پڑھ کر سنا دیا ہے۔اس کی نسبت مجھ کو کچھ زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ تمام حضرات جو اس وقت اس بڑے ہال میں جمع ہیں، بخوبی واقف ہیں کہ جس طرح اب سے چند برس پہلے ان لوگوں کی تعداد نہایت کم تھی جو انگریزی تعلیم کو جائز سمجھتے تھے، آج وہ لوگ صرف معدودے چند ہیں جن کو انگریزی تعلیم کی ضرورت سے انکار ہے۔اب یہ صدا نہایت عام ہوگئی ہے۔ گھر گھر اس کے چرچے ہیں۔ ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک ہر جگہ اسی کا رونا ہے۔صرف زبانی باتوں پر بس نہیں ہے بلکہ عموماً عملی کارروائیاں بھی شروع ہوگئی ہیں۔ ہر جگہ کلب، انجمنیں، مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں، لیکن یہ تعجب ہے کہ اس سرگرمی اور جوش کا کوئی معقول اثر ملک میں محسوس نہیں ہوتا۔ ہماری تعلیم کو جو غیر قوموں سے نسبت تھی، اس میں بہت کم فرق پیدا ہوا ہے۔اعلیٰ تعلیم اسی طرح پستی کی حالت میں ہے۔گریجویٹوں کی تعداد اب بھی اکائی کی حد سے نہیں بڑھتی، جس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہوسکتی ہے کہ قوم نے تعلیم کے مختلف درجوں کی ضرورتوں پر غور نہیں کیا۔مختلف لوگ مختلف کوششوں

میں مصروف ہیں، جس کی وجہ سے کوئی مجموعی طاقت نہیں پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے تمام قوم کو یہ طے کر لینا چاہئے کہ ہم کو کس تعلیم کی زیادہ تر ضرورت ہے۔ جب ایک خاص تعلیم کی ضرورت عموماً تسلیم ہو جاوے تو سب مل کر اس پر متوجہ ہوں۔ اس طرح قوم کی مجموعی کوششوں کا رخ ایک طرف بدل جائے گا۔ لیکن یہ تعیین کوئی آسان مضمون نہیں ہے۔ اور جب تک کہ قوم کے بہت سے عالی خیال حضرات اس پر بحث نہ کریں اور ان میں باہم مبادلہ خیالات نہ ہو، اس کا قطعی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ انہیں وجوہ سے میری خواہش ہے کہ اس مضمون پر کہ کون سی تعلیم مقدم تر اور ضروری تر ہے، ''ایس سے'' لکھوائے جائیں اور جو ''ایس سے'' سب سے عمدہ ہو، اس پر ایک انعام جو مقدار میں سو ۱۰۰/ روپے سے کم نہ ہو مقرر کیا جاوے۔

اس طرح اس بحث کے تمام پہلو قوم کے سامنے آجاویں گے اور پھر جو فیصلہ ہو گا وہ قطعی اور مسلم الثبوت ہوگا۔

میں نے مختصر طور پر رزولیوشن کی ضرورت بیان کر دی ہیں، لیکن امید ہے کہ میرے موید جناب آنریبل سید احمد خاں صاحب نہایت تفصیل (۱) کے ساتھ اس پر گفتگو فرمائیں گے۔(۲)

تعلیقات و حواشی

(۱) سر سید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] بانی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ایم اے او کالج علی گڑھ

(۲) بحوالہ باقیات شبلی ص ۴۳-۴۵

○○○

[۵]

الاسلام (۱)

(مذہب انسان کی فطرت میں شامل ہے)

انسان اور حیوان کا مقابلہ کرو۔ حیوان اپنی تمام ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کا لباس ان کے ساتھ ہوتا ہے جو موسم کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجہ، ناخن، ڈنک کے ہتھیار کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ جن غذاؤں پر اس کی زندگی کا مدار ہے پیدا ہونے کے ساتھ اس کو ہر طرف جنگل ہو یا پہاڑ، خشکی ہو یا دریا، ویرانہ ہو یا آباد ہر جگہ مہیا ملتی ہیں۔

انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کی جلد نازک ہوتی ہے ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں۔ جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا۔ دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ جتنی چیزیں اس کے گرد وپیش ہوتی ہیں سب کی سب اس کی دشمن نظر آتی ہیں۔ آفتاب کی گرمی، بادلوں [بارشوں] کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ، جاڑوں کی ٹھنڈ ہر چیز چاہتی ہے کہ اس کو تباہ کر دے۔ **خُلِقَ الْاِنسَانُ ضَعِیْفاً**۔ (نساء . ۵۳)

ان مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی مادی

ہتھیار نہیں دیا، کیوں کہ جن بے شمار اور پر زور دشمنوں کا اس کو سامنا کرنا تھا، اس کے لئے کوئی مادی آلہ کافی نہیں ہوسکتا تھا۔ قدرت نے اس کو مادی ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی جس نے ہر مخالف کے مقابلے کا جدا سامان تیار کیا۔ دھوپ، گرمی، جاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلے کے لئے تیغ و خنجر تیار کئے۔ دریاؤں پر پل باندھے۔ پہاڑ تراشے۔ لوہا پگھلایا۔ برق کو مسخر کیا۔ ہوا کو تھاما۔ غرض تھوڑے عرصے کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اس کے پنجۂ اقتدار میں تھی۔ اس عام قوت کا نام عقل کلّی یا عقل انسانی ہے۔ لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطے پر بھی پہنچ کر ٹھہرنے نہ پائیں اس لئے وہ (یعنی قدرت) اک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے، جس سے انسان پر نئی نئی طرح سے حملے کئے جاتے ہیں۔ جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو چکا تھا ان کے علاوہ نئے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ جس قدر دریافت ہو چکا ہے اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتا لگتا ہے اور وہاں نئی ضروریات پیش آتی ہیں۔ آرام و آسائش کے جو سامان مہیا ہو چکے تھے، راحت طلبی کا مادہ بڑھ کر وہ سامان بے کار ہو جاتے ہیں۔ مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلے کے لئے نئی تیاریاں کرتا ہے اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔

عالم کائنات اور انسان کی یہ باہمی کشمکش اور دار و گیر ہی وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے اور جس کی بدولت آج سیکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قائم ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے زیادہ سخت اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک اور گروہ ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور جن سے اس کو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں۔ طمع آمادہ کرتی ہے کہ عزیز و بیگانہ، دوست و دشمن، دور و نزدیک کی تمام دولت و مال پر قبضہ کر لیا جاوے۔ کنبہ پروری کا تقاضا ہے کہ مخالفوں کا نام

صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاوے۔غرور چاہتا ہے کہ جب تک تمام عالم کی گردنیں جھک نہ جائیں آرام نہ لے۔عیش پرستی چاہتی ہے کہ دنیا کی کوئی ناجائز لذت باقی نہ رہ جاوے۔ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک عقل کام آتی ہے۔وہ بتاتی ہے کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کرو گے تو وہ بھی کرے گا،تم کسی کو برباد کرنا چاہو گے تو وہ بھی چاہے گا۔تم دوسروں کی عزت نہ کرو گے تو وہ بھی نہ کریں گے۔لیکن اولاً اس قسم کی پیش بینی اور انجام اندیش عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص کی ہوسکتی ہے۔اس کے علاوہ بہت سے ایسے موقعے پیش آتے ہیں جہاں اس قسم کے انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔حکومت کا خوف،جاسوس کا ڈر،بدنامی کا احتمال،انتقام ایک چیز بھی نہیں ہوتی۔ان موقعوں پر عقل ان پرزور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ ایک دوسری قوت ہے جو سینہ سپر ہوتی ہے اور انسان کو ان دشمنوں کے حملے سے بچاتی ہے۔اس قوت کا نام ''نور ایمان''،کانشنس''،''حاسۂ اخلاقی'' ہے اور وہی مذہب کی بنیاد ہے۔

یہ قوت انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے۔عالم و جاہل،رذیل و شریف،شاہ و گدا،افریقہ کا حبشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔یہی معنی ہیں قرآن کی اس آیت کے:

''فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لَخَلْقِ اللّٰهِ ذَلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِمُ وَلَكِن اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔''(روم۔۳۰)

اپنا منہ دین حنیف کی طرف کر،یہ ہی اللہ کی فطرت ہے اور آدمیوں کو اسی فطرت سے پیدا کیا ہے،اور خدا کے پیدا کرنے میں تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ ہی دین مضبوط ہے مگر آدمی نہیں سمجھتے۔

جرمنی کا ایک حکیم گسلر لکھتا ہے:

''مذہب ابدی چیز ہے کیونکہ مذہب جس حاسے کا نتیجہ ہے وہ کسی

زمانے میں کبھی معدوم نہیں ہوسکتا۔''

فرانس کا مشہور فاضل معلم رینان اپنی کتاب ''تاریخ مذہب'' میں لکھتا ہے:

''یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیا، جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محبوب ہیں، مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہوجائے یا اس کی قوت میں زوال آجائے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا علانیہ ثبوت دے گا کہ مادی مذہب (میٹریالزم) بالکل غلط ہے جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے۔''(۲)

پروفیسر سیسٹر ''فلسفۂ دینیہ'' میں لکھتا ہے:

''میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لئے کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے۔ میں نے خود اپنی رائے پر بھی اعتراض کیا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور حل نہیں ہوتا۔ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی زندگی کے لئے ہے اس سے زیادہ عام انسانی سوسائٹی کو ہے۔''

''مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالے گئے ہیں لیکن جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کر لئے ہیں۔ اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہوسکتی۔ مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور زیادہ گہرا کرتے ہیں۔ انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پائے گی۔''(۳)

مذہب کے فطری ہونے کی ایک دوسری دلیل یہ ہے کہ دنیا میں افرادانسانی کے خاص خاص مختصات یعنی زبان،قوم، ملک،صورت، رنگ کوحذف کرتے جاؤ تو جو چیزیں قدرمشترک رہ جائیں گی ان میں ایک مذہب ہوگا۔جن چیزوں کوہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں مثلاً اولاد کی محبت، انتقام کی خواہش،کمال کی قدردانی وغیروغیرہ، ان کے فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔اس بنا پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہرقوم، ہرطبقہ، ہرنسل کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو یہ مسئلہ صاف ثابت ہوجاتا ہے کہ مذہب فطری چیز ہے۔یہی وجہ ہے کہ مذہب کے مقدم اصول تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں۔خدا کا وجود،اس کی پرستش کا خیال، حیات بعد الموت، اعمال کی جزاوسزا، رحم دلی، ہمدردی، عفت کواچھا سمجھنا، جھوٹ، دغا، زنا، چوری کو براجاننا دنیا کے تمام مذہبوں کا اصل اصول ہے۔

فطرت نے افرادِانسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے۔دولت و مال، جاہ و حشم، فضل وکمال، ذہن وذکا کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی؛ سکندروتیمور، ارسطو، افلاطون، ہومر، فردوسی اسی فیاضی کے نمونے ہیں۔

دوسری طرف یہ بخل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا فرق رہ جاتا ہے کہ ڈارون کونظر نہیں آتا۔بااین ہمہ جو باتیں شرط زندگی اور مدار حیات ہیں، وہ تمام افرادانسانی کو یکساں عطا کی ہیں۔افریقہ کا جاہل سے جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، سوتا جاگتا، بولتا چالتا ہے، جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کوانجام دیتا ہے۔

اسی سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جوتمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے، لازمۂ انسانی تھا اوراس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں کو یکساں عطا کیا۔ ارسطواور ملٹن بہت سے دلائل کے بعداس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ سچائی، دیانت داری، عفت، علم اچھی چیز ہیں لیکن افریقہ کا ایک وحشی بغیرکسی تعلیم اور بغیرکسی دلیل کے خودبخود ان چیزوں

کو اچھا جانتا اور سمجھتا ہے۔

مذہبِ اسلام

یہ تو ثابت ہو چکا کہ مذہب فطری چیز ہے، یعنی جس طرح انسان میں ہمدردی، محبت اور انتقام کے قدرتی جذبات پائے جاتے ہیں، اسی طرح میلان مذہب بھی قدرتی اور فطری ہے اور جس طرح اور قدرتی جذبات کسی شخص میں کم، کسی میں زیادہ، کسی میں بہ ضعف، کسی میں بہ شدت، اور شاذ و نادر افراد میں بالکل نہیں پائے جاتے، بعینہٖ مذہب کا یہی حال ہے۔ لیکن چونکہ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) حاسۂ مذہبی اس بنا پر انسان کو عطا کیا گیا ہے کہ بغیر اس کے نوع انسانی کا بقا ممکن نہ تھا اس لئے مذہب کا اس قدر حصہ تمام انسانوں میں یکساں مشترک ہے، وہ نہایت سادہ مجمل اور ناتمام ہے، اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس کی صاف اور صریح تمثیل یہ ہے کہ انسان کے زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا، گرمی سردی سے بچنا ضروری ہے، اس لئے قدرت نے ان ضروریات کا سامان ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے لئے بھی مہیا کیا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سامان اعلیٰ درجے کے بھی ہوں۔ کھانے کے لئے سدِ رمق، رہنے کے لئے پھونس کا جھونپڑا، لباس کے لئے درختوں کے پتے بھی مہیا ہو گئے تو قدرت کا فرض ادا ہو گیا۔ مختلف قسم کے الوانِ نعمت، عالی شان محل، بیش بہا ملبوسات، سب کے لئے مہیا ہونا ضرور نہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْض. (بقرہ. ۲۸۳)

یہی حال مذہب کا ہے۔ خدا کا وجود، عبادت کی فرضیت، معاد کا خیال، جزا و سزا کا یقین، نبوت کا اعتراف لازمۂ انسانی ہیں اس لئے سب فرقوں میں مشترک ہوگا اور اس میں کسی قوم اور کسی فرقے کی تخصیص نہیں، لیکن یہ امور کہ خدا کے کیا اوصاف ہیں؟ کس قسم کی عبادت فرض ہے؟ کیوں فرض ہے؟ معاد کی کیا حقیقت ہے؟ جزا و سزا سے کیا غرض ہے؟

نبوت کے کیا معنی ہیں؟ ان سوالات کا جس مذہب میں جس قدر صحت، باریک بینی اور حقیقت سنجی سے جواب ملے گا، اسی قدر وہ مذہب کامل اور اعلیٰ تر ہوگا۔ یورپ میں منکرین مذاہب کا جو گروہ پیدا ہوگیا ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے، ان کے انکارِ مذہب کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کسی مذہب میں سوالات مذکورہ بالا کا جواب صحیح اور مکمل نہیں پاتے۔ پروفیسر لاردس مذہب کی مخالفت اس بنا پر کرتے ہیں:

''اگر ہم کہتے ہیں کہ ان باتوں کا اعتقاد کرنا چاہئے جو عقل میں آئیں تو ہم سے کہا جاتا ہے نہیں، ہرگز نہیں۔ پھر عقل کو جو نیک و بد کی تمیز ہے ذلیل کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں اس قدر اندھی کر دی جاتی ہیں کہ خرق عادت ایک معمولی بات بن جاتی ہے۔ سفید سیاہ ہوجاتا ہے، بدنما چیز خوش نما ہوجاتی ہے تو مذہب آتا ہے اور کہتا ہے کہ ''گردن ڈال دو'' کس کے آگے؟ عقل کے آگے؟ نہیں فطری فرائض کے آگے؟ نہیں احساسات اندرونی کے آگے؟ نہیں۔ اصولِ فطرت کے آگے؟ نہیں!'' (۴)

مانسیو کان ستان نے جو فرانس کا مشہور عالم ہے، مذہب کی حقیقت اور مذہب کے نشو ونما پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ مذہب کے نقصانات کی تفصیل بیان کر کے لکھتا ہے کہ

''مذہب جن بنیادوں پر قائم ہوا ہے، وہ علم کے مخالف ہیں اور اس لئے یہ قطعی ہے کہ تمام مذاہب برباد ہوجائیں۔'' (۵)

برتلو لکھتا ہے:

''علم نے اپنی پوری آزادی حاصل کر لی ہے اور اس بات کا خوف نہیں رہا کہ مذہب اس کو دبا لے۔''

ان تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان منکرینِ مذاہب کے نزدیک چونکہ مذہبی اصول، عقل، تمدن اور تحقیقات علمی کے مخالف ہیں اس لئے وہ صحیح نہیں ہو سکتے، ورنہ اگر کوئی مذہب ایسا ہو جس کے تمام اصول عقل کے موافق ہوں تو ان مفکرین کو بھی اس کے تسلیم سے انکار نہیں۔ اسی بنا پر یورپ کے بڑے بڑے محققین نے مذہب کا ایک خاکہ کھینچا ہے اور اس کا نام ''دیانۃ طبیعیہ'' رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذاہب موجود بالکل غلط ہیں۔ لیکن اگر ایک نیا مذہب ایجاد کیا جاوے جس کے اصول حسب ذیل قرار دیے جاویں تو وہ بے شبہہ تسلیم کے قابل ہوگا اور تحقیقات علمی کا ساتھ دے سکے گا (٦):

۱۔ مذہب کے تمام معتقدات اور مسائل عقل کے موافق ہوں۔ کوئی چیز تقلیداً نہ منوائی جائے۔

۲۔ عبادت مقصود بالذات نہ ہوں بلکہ ان کا نفع خود بنی نوع انسان کو پہنچے۔

۳۔ دین و دنیا کا رشتہ ایسا قائم کیا جاوے کہ ایک دوسرے کو صدمہ نہ پہنچائے، بلکہ ایک دوسرے کا معاون ہو۔

اب ہم کو ان تینوں اصول کے معیار کے موافق مذہبِ اسلام کو جانچنا چاہیے۔

عقل اور مذہب

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ تمام مذاہب میں عقل کو کیا درجہ دیا گیا ہے اور اسلام نے عقل کی کیا منزلت قائم کی ہے۔

> ''دنیا میں آج جس قدر مذہب موجود ہیں ان سب میں تلقین کی ابتدا
> اس حکم سے شروع ہوتی ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔''

یہی جابرانہ حکم ہے جس کی بدولت مذہب ہر قسم کی تحقیقات، تجربہ اور اجتہادات سے مطمئن رہتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز اس کی جباری کو کم نہیں کر سکتی۔ اسی کا اثر ہے کہ

ایک شخص منطق، فلسفہ، ریاضیات میں سیکڑوں عجیب وغریب ایجادات کرتا ہے اور ارسطو و افلاطون کی تحقیقات کو غلط ثابت کرتا ہے، تاہم جب اس کے سامنے کسی غلط مذہبی مسئلے کا ذکر آتا ہے تو اس کی نقادی اور نکتہ سنجی بالکل بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ سقراط اتنا بڑا فلسفی ہو کر جان دینے کے وقت وصیت کرتا ہے کہ فلاں بت پر میں نے نذر چڑھانے کی جو منت مانی تھی وہ پوری کی جاوے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام مذاہب میں سیکڑوں حکما و علما پیدا ہوتے ہیں لیکن مذہب کے لغو سے لغو عقیدے کی نسبت بھی ان کو شک نہیں پیدا ہوتا۔ عقل کی اس بے کاری سے صرف یہ نقصان نہیں پہنچتا ہے کہ جو لغو عقیدہ ایک دفعہ قائم کر لیا گیا تھا وہ اپنے حال پر قائم رہتا ہے بلکہ توہمات اور عجائب پرستی کو روز بروز زیادہ بار ملتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چند روز کے بعد مذہب کے سچے اور صحیح عقائد بھی ان توہمات کے ہجوم میں چھپ جاتے ہیں اور مذہب ہمہ تن عجائبات اور ناممکنات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے یورپ کے آزاد خیالوں کو مذہب سے متنفر بنا دیا ہے۔ پروفیسر لاردس نے تمام مذاہب کے برباد ہو جانے کی جو پیش گوئی کی ہے، اسی بنا پر کی ہے کہ ''مذہب عقل کو برباد کرنا چاہتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ خود برباد ہو جائے۔'' یہی پروفیسر ایک مقام پر لکھتا ہے کہ

> ''اگر ہم بغیر خودغرضی اور وہم پرستی کے اس بات کا پتا لگائیں کہ دنیا میں آج جس قدر مادی، دماغی اور اخلاقی ترقیاں ہوئی ہیں ان کا اصلی سبب کیا ہے تو صرف یہ جواب ہے کہ عقل کا مذہبی شکنجے سے نجات پانا۔''(۷)

اب دیکھو اسلام کی تلقین کیا ہے؟ قرآن مجید نے یہودیوں، عیسائیوں، بت پرستوں اور ملحدوں کو سیکڑوں جگہ مختلف طریقوں سے عقائد اسلام کی دعوت دی ہے لیکن ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا کہ تقلیداً ان عقائد کو مان لو بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اجتہاد اور غور کے ذریعے سے ان کو منوانا چاہا ہے اور تقلید پرستی کی سخت برائی کی ہے۔ مخالفین اسلام کی سب سے بڑی

غلطی جو ظاہر کی ہے یہ ہے:

"وَ کَاَیِّن مِن آیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْھَا وَ ھُمْ عَنْھَا مُعْرِضُوْن."

(یوسف. ۱۰۵)

اور بہتیری نشانیاں آسمان اور زمین میں ہیں جس میں ہو نکلتے ہیں اور ان پر دھیان نہیں کرتے۔

"لَھُم قُلُوْب لَّا یَفْقَھُوْن بِھَا." (سورۂ اعراف۔۱۷۹)

اور ان کے دل ایسے ہیں کہ اس کو نہیں سمجھتے۔

"اِنَّا وَجَدْنَا آبَائَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ وَ اِنَّا عَلٰی آثَارِھِمْ مُقْتَدُوْن." (زخرف۔۲۳، پارہ۲۵)

ہم نے جس طریقے پر پائے اپنے باپ دادے اور ہم انہیں کے قدموں پر ہیں۔

"بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ آبَاءَ نَا (لقمن. ۲۱)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ. (لقمن. ۲۰)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرآنَ. (نساء. ۸۲)

قُلِ انْظُرُوْا مَا فِی السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ."

بلکہ ہم اپنے آبا واجداد کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ بعض آدمی بغیر علم کے اللہ کے متعلق جھگڑا کرتے ہیں۔ کیا اس پر غور نہیں کرتے۔ قرآن مجید میں ہے کہ کہہ دو محمد (ﷺ) دیکھو تم اس چیز کو جو درمیان آسمان اور زمین کے ہے۔ کیا نہیں دیکھا انہوں نے آسمان اور زمین میں؟

"سَنُرِیْھِمْ آیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْ اَنْفُسِھِمْ." (حم السجدہ. ۵۳)

قریب ہے کہ دکھلاویں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں عالم میں اور ان کے دلوں میں۔

نفس مذہب کی ضرورت اس طرح ظاہر کی۔

"اَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفاً فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ

اللّٰہِ." (روم. ۳۰)

قائم ہو سیدھے دین پر۔ اللہ کی فطرت وہ ہے کہ قائم ہیں لوگ اس پر۔ اللہ کی فطرت میں تبدیلی نہیں۔

اسلام کی دعوت کا حکم دیا تو اس کے یہ طریقے بتائے:

" اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّک بالْحِکْمَۃِ والْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِی ھِیَ اَحْسَنُ."(نحل. ۱۲۵)

بلا تو اپنے رب کے راستے کی طرف اچھی اور عمدہ نصیحتوں سے اور تو ان سے تقریر کر اچھے طریقے سے۔

خاص خاص عقائدِ اسلامی جہاں بیان کئے، ہر ایک عقیدے کے ساتھ اس کی عقلی دلیل بیان کی۔ خدا کے ثبوت کے دلائل تو اس کثرت سے قرآن میں مذکور ہیں کہ اس لیکچر میں اس کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ خدا کی وحدانیت کو اس طرح ثابت کیا:

" لَوْ کَانَ فِیْھِمَا اٰلِھَۃ اِلَّا اللّٰہ لَفَسَدَتَا." (انبیاء. ۲۲)

اگر ہوتے ان میں کئی معبود سوا اللہ کے، یقیناً ان میں خرابی پڑ جاتی۔

خدا کے عالم ہونے کی یہ دلیل بیان کی:

"الا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ."(ملک. ۱۴)

کیا پس نہیں جانتا اس کو جس نے پیدا کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر جو استعجاب تھا، اس طرح رفع کیا:

"قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعاً مِنَ الرُّسُلِ." (احقاق. ۹)

کہہ دو اے محمدؐ! نہیں ہوں میں نیا رسولوں میں سے۔

آنحضرتؐ کی نبوت کو اس طرح ثابت کیا:

"یُعَلِّمُھُم الْکِتَابَ والْحِکْمَۃَ." (بقرہ. ۱۲۹)

سکھائی اس نے ان کو کتاب اور حکمت۔

معاد کے ممکن ہونے کا اس طرح یقین دلایا:

"قُلْ يُحْيِهَا الَّذِىْ اَنْشَاءَ هَا اَوَّلَ مَرَّةٍ.(یٰسین. ۷۹)

أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُحْيِى الْمَوْتٰى .(قیامه. ۴۰)

اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ".

(صٰفت. ۸۱)

کہہ دو اے محمدؐ! وہی ذات زندہ کرتی ہے مردوں کو جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کرے؟ کیا وہ ذات قادر نہیں آسمان اور زمین کے مثل پیدا کرنے پر؟

معاد کی ضرورت اس طرح ثابت کی:

"اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَا كُمْ عَبَثاً وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ." (مومنون. ۱۱۵)

کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو پیدا کیا بیکار؟ اور تحقیق تم ہماری طرف نہ لوٹو گے؟

غرض خواہ نفس، مذہب، خواہ بالخصوص مذہب اسلام، خواہ خاص خاص اسلامی عقائد، جس چیز پر یقین دلانا چاہا، ساتھ ہی دلیل بھی بیان کی۔ ایک جگہ نہیں کہا کہ ان عقائد کو بلا دلیل تسلیم کرو۔

دین و دنیا یا جسمانیات اور روحانیات کا باہمی تعلق اور اس کا موازنہ

مذہب کے نقص و کمال، صحت و غلطی، خوبی و عیب کا سب سے بڑا معیار دین و دنیا یا جسم و روح کے تعلقات کا موازنہ ہے۔ ابتدائے عالم سے اسلام تک بلکہ اسلام مستثنیٰ کر دیا جاوے تو تمام عالم میں آج بھی جس قدر مذہب ہیں، سب نے اس بات میں یک طرفہ

فیصلہ کیا ہے۔

فرقہ اباحیہ (۸) اور مزدکیہ (۹) صرف دنیاوی لذائذ کے قائل ہیں۔ باقی مذاہب نے دنیا کی تمام تمتعات کو ہیچ بتایا اور جس نسبت سے انسان دنیاوی حظوظ سے کنارہ کش رہے، اسی نسبت سے اس کے کمال کے درجے قائم کیے۔ اسی خیال نے دنیا میں جوگی، تارک الدنیا، راہب، منک (۱۰)، ننز (۱۱) پیدا کیے اور ان فرقوں کی وہ عزت دلوں میں قائم کی کہ بڑے سے بڑے شہنشاہ کا سر ایک ذلیل بوریانشین کے آگے جھک جاتا ہے۔ دنیا کو بالکل ذلیل و ہیچ کہنا اور اپنی تمام رغبتوں اور خواہشوں کو قتل کر دینا مذہب کا اصلی عنصر بن گیا ہے۔

فویرباش لکھتا ہے کہ مذہب کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ ملکی اور سیاسی زندگی تباہ کر دی جائے اور دنیا کے تمام کاروبار لغو سمجھ کر اس غرض سے چھوڑ دئے جائیں کہ نہایت خضوع کے ساتھ بہشت کے انتظار میں گھلا جائے اور یہ کہ ہر قسم کی فطری و طبعی جذبات اور خواہشیں قتل کر دی جائیں۔ (۱۲)

لاردس لکھتا ہے:

''زاہدوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ فطرتی خواہشوں کا جو اثر ان پر ہے اس کو بالکل مٹا دیں۔'' (۱۳)

مذہب کی تخصیص نہیں، فلسفہ وحکمت کا میلان بھی ہمیشہ اسی طرف رہا ہے۔ سقراط، افلاطون، دیوجانس کلبی، ابونصر فارابی (۱۴) جوگیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ خوب غور سے دیکھو؛ یہ خیال تمام دنیا پر کس قدر چھا گیا ہے۔ ہم جب کسی شخص کی نسبت سنتے ہیں کہ دنیا اس کی نظر میں ہیچ ہے، فرش خاک پر پڑ رہتا ہے، نان ونمک پر بسر کرتا ہے تو خود بخود ہمارے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہے اور ہم اس بات کی تلاش تک نہیں کر سکتے کہ ان باتوں کے سوا ان میں کمال بھی ہے یا نہیں۔ یہ اسی دنیا کی بے قدری

کا اثر ہے جو تمام مذاہب میں پھیلا ہوا ہے اور جس میں ہم مسلمان بھی آلودہ ہو جاتے ہیں۔

دین و دنیا کا موازنہ اور دونوں کے تناسب کو ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر ایک ناممکن الحصول مقصد کی طرح اس پر حسرت ظاہر کرتے ہیں۔ ہنری برالجیہ ''رویو آف رویوز'' جلد ۲۴ میں لکھتا ہے:

> ''آہ! کاش کوئی ذہین شخص مذہبی اور علمی تعصب دونوں نقاب کو ایک ساتھ چاک کر ڈالتا اور اس مضبوط تعلق کو، جو مذہبی خیال اور علمی تفکر میں ہے، کھول کر دکھا دیتا۔ ایسا کرنے سے جو رنج دہ کشمکش ان دونوں میں ایک مدت سے چلی آتی ہے، وہ مٹ جاتی۔ اگر کوئی شخص ایسا کر سکے تو آج کا نیا زمانہ کیسی دھوم دھام اور کس جوش سے اس کے استقبال کے لئے تیار ہوتا۔''

اب دیکھو اسلام نے دونوں کا کیوں کر موازنہ کیا؟ سب سے پہلے جوگی پن اور ترک دنیا کے خیال کو مٹایا:

''وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا.'' (حدید. ۲۷)

اور ایک دنیا چھوڑنا انہوں نے نیا نکال لیا۔ ہم نے ان پر نہ لکھا تھا، مگر چاہنے کو رضامندی اللہ کی، پھر نہ نباہا اس کو جیسا نباہنا چاہیے۔

''وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا.'' (قصص. ۷۷)

نہ بھلا تو اپنے حصے کو دنیا سے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. (مائدہ. ۸۷)

اے ایمان والو! اللہ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے تم حرام نہ کرو اور حد سے نہ

بڑھو۔ اللہ نہیں پسند کرتا زیادتی کرنے والوں کو۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِی اَخْرَجَ لِعِبَاده.(اعراف. ۳۲)

تو کہہ، کس نے منع کی ہے زینت اللہ کی جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کے واسطے

"وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ.(اعراف. ۳۲)

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ لا تُسْرِفُوْا .(اعراف. ۳۱)

فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ.(جمعه. ۱۰)

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا .(بقره. ۲۸۶)

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسر .(بقره. ۱۸۵)

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُخَفِفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفاً .(نساء. ۲۸)

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَن لايَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ. (مائده. ۶)

اور عمدہ چیز کھانے کی کھاؤ اور پیو اور مت اڑاؤ۔ پس گھومو تم زمین میں اور تلاش کرو خدا کا فضل۔ اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ نہیں دیتا۔ اللہ تم سے آسانی چاہتا ہے کیوں کہ پیدا کیا گیا ہے انسان کو کمزور۔ اللہ نہیں چاہتا تم پر مشکل۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بتایا کہ دنیا کی ہر قسم کی جائز ناز و نعمت، جاہ و حشمت، لذیذ مشروبات و ماکولات مسلمانوں کا حصہ ہیں۔

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ والطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِیَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْافی الحيوٰةالدنياخَالِصَة يَوْمَ الْقِيَامَة." (اعراف. ۳۲)

تو کہہ کس نے منع کی ہے زینت اللہ کی جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کے واسطے اور عمدہ چیزیں کھانے کی۔ کہہ تو وہی طیبات ان لوگوں کے واسطے ہیں جو پوری طور پر قیامت پر ایمان لائے۔

تمام دیگر مذاہب کی یہ تلقین ہے کہ اس وسیع دنیا سے انسان کا حصہ سدّ رمق کھانا اور

دو گز کپڑا ہے۔ لیکن اسلام یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے، زمین، دشت، کوہ، دریا، درخت، چارپائے، لعل و جواہر، فواکہ و روائح سب انسان کے لئے ہے اور اس لئے ہے کہ انسان سب پر قابو چلائے اور سب سے تمتع اٹھائے اور جائز طور پر لطف اٹھائے۔

اَلَمْ تَرَوا اَنّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ .(حاشیہ.۱۳)

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً مِنّہُ اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَبَاطِنَۃَ .'' (لقمان.۲۰)

وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ والنَّھَارَ وَالشَّمْسَ والْقَمْرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِہٖ. (نحل.۱۲)

کیا نہیں دیکھا تم نے تحقیق اللہ نے تابع کیا تمہارے ان چیزوں کو جو کہ آسمان و زمین میں ہیں۔ اور تابع کیا ہے تمہارے ان سب چیزوں کو جو زمین اور آسمان میں ہیں۔

اور تم پر پورا کیا اپنی نعمت ظاہرہ و باطنہ کو اور تابع کیا تمہارے رات اور دن، آفتاب، چاند اور ستارے اپنے حکم سے۔

''اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ .(حج.۶۵)

وَھُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ البَحْرَ لِتَا کُلُوْا مِنہُ لَحْماً طَرِیاً وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْہُ حِلْیَۃً تَلْبَسُوْنَھَا .(نحل.۱۴)

کیا نہیں دیکھا تم نے تحقیق اللہ نے تابع کیا تمہارے ان چیزوں کو جو کہ زمین میں ہیں اور وہ ایسی ذات ہے کہ تابع کیا اس نے دریا کو تاکہ کھاؤ تم اس سے گوشت تازہ اور نکالو تم ان سے زیورات پہننے کے لئے۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَّ حَفَدَۃَ وَّ رَزَقَکُمْ مِنَ الطَّیِّبَات .(نحل.۷۲)

وَ مِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِیْلِ وَالاَعْنَابِ تتَّخِذُوْن مِنْہُ سکروَّ رِزقاً حَسَناً .(نحل.۶۷)

"وَّ مَاذَ رَأَ لکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفاً اَلْوَانُہٗ.(نحل.۱۳)

وَالانْعَامُ خَلَقَھَا لَکُمْ فِیْھَا دِفْ ءٌ وَمَنَافِعُ وَ مِنْھَا تاکُلُوْنَ وَلَکُمْ فِیْھَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَ حِیْنَ تُسْرِحُوْنَ.(نحل.۵،۶)

وَالْخَیْلَ والْبِغَالَ والْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْھَا وَ زِیْنَۃً.(نحل.۸)

یُنْبِتُ لَکُمْ بِہِ الذَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَ مِنْ کُلّ الثَمَراتِ.(نحل ۱۱)

وَجَعَلَ لَکُمْ مِنَ الْفُلْکِ وَالانْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ لِتَسْتَوُا عَلٰی ظُھُوْرِہٖ. (زخرف.۱۲،۱۳)

اللہ نے تمہیں میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا اور دیئے تم کو تمہاری عورتیں سے بیٹے، پوتے۔اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں۔اور پھلوں میں سے کھجور اور انگور ہیں کہ بناتے ہو تم ان سے نشیلی اور کھانے کی چیزیں۔اور جو بکھیرا ہے تمہارے واسطے زمین میں کئی رنگ کا اور چوپائے بنادیے، تم کو ان میں جڑاول ہے اور کئی فائدے ہیں جن میں سے بعضوں کو کھاتے ہو اور تم کو ان سے رونق ہے۔ جب شام کو پھیر لاتے ہو اور جب چراتے ہو اور گھوڑے بنائے؛ خچر اور گدھے تا کہ ان پر سوار ہو اور رونق۔اگاتا ہے اس سے تمہارے واسطے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے میوے۔اور بنائی تمہارے واسطے کشتی اور چوپائے تا کہ سوار ہو تم ان پر۔

"ثُمَّ تَذْکُرُوا نِعْمَۃَ رَبکُمْ اِذَا سْتَوَیْتُمْ عَلَیْہِ و تَقُولُوْا سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخرَلَنَا ھٰذا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ. (زخرف.۱۳)

فَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلالاً طَیّباً وَاشْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ اِنْ کُنتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْن. (نحل.۱۱۴)

پھر یاد کرو تم اپنے رب کو جس وقت کہ ان پر سوار ہو اور کہو تم پاک ہے وہ ذات کہ

تابع کیا اس نے ہماری ان چیزوں کواور نہ تھے ہم اس کے قابل۔

پس کھاؤ تم جو کچھ اللہ نے حلال پاک رزق عطا کیا ہے اور شکر ادا کرو اللہ کی نعمتوں کا اگر تم عبادت کرتے ہو۔''

یہ خطبہ تحریری تھا مگر علامہ شبلی نے تحریری خطبے کے بعد زبانی خطبہ دیا، نقل نویسوں نے یہ خیال کر کے کہ خطبہ تحریری ہے آخر کا خطبہ نقل نہیں کیا جو کہ بقول مرتب روداد خطبے کی جان تھا، البتہ انہوں نے اس کا خلاصہ درج روداد کیا ہے جو درج ذیل ہے:

> ''دنیا اصل میں تین چیزوں کا نام ہے؛ مال، اولاد، مقبولیت و نیک نامی اور تینوں کی جدا جدا تعریف کر کے قرآن شریف کی آیات سے ثابت کیا تھا کہ جائز طریقے سے ہر ایک کا حاصل کرنا عین دین داری ہے۔ ایک نہایت عمدہ بات یہ بیان کی تھی کہ تمام مذاہب دین و دنیا کو الگ الگ سمجھتے ہیں اس لئے دونوں میں سے ایک پر توجہ کرنے میں خواہ مخواہ دوسرے کا پلہ دب جاتا ہے۔ اسلام نے بتایا کہ دنیا اگر اچھی طرح برتی جاوے تو عین دین ہے۔ یہ بھی بتایا تھا کہ اسلام پر چلنے والوں کو دنیا کی تمام نعمتیں مل جاتی ہیں۔ ثبوت میں صحابہ اور ان لوگوں کے تاریخی حالات بیان کئے تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ بھی بیان کیا تھا کہ اسلام نے غلاموں کو بادشاہ بنایا اور ان غلاموں کے تاریخانہ (کذا) حالات بیان کئے جو بادشاہ، وزیر اور سپہ سالار فوج گزرے ہیں۔''

تعلیقات و حواشی

(۱) روئداد انجمن (حمایت اسلام)، ص ۵ تا ۱۷

(۲) یہ دونوں قول تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ، ص۲۴و۲۵ میں مذکور ہیں۔

(۳) الحیوۃ حال۔اول،ص۱۵۵

(۴) ماخوذ از تطبیق،ص۲۴

(۵) تطبیق،ص۲۲

(۶) تطبیق،ص۳۰

(۷) تطبیق،ص۴۳

(۸) ہر چیز کی اباحت کا قائل فرقہ

(۹) مزدک نام ایک شخص کیقباد بدر نوشیرواں شاہ ایران کے زمانے میں مذہبِ اباحت کا بانی گذرا ہے۔ جب نوشیرواں تختِ ایران پر متمکن ہوا تو اس نے مزدک کو مع رفیقوں کے قتل کرا دیا۔ مزدک نے جو مذہب نکالا تھا اس کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ تمام ملک کی عورتیں اور کل قوم کا مال ایک دوسرے کو اپنے صرف میں لانا جائز ہے۔ دبستان المذاہب میں اس کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

(۱۰) انگریزی لفظ ہے تارک الدنیا

(۱۱) پہلا لفظ ذکور کے واسطے اور یہ اناث کے واسطے بولا جاتا ہے۔

(۱۲) تطبیق،ص۲۳

(۱۳) تطبیق،ص۵۴

(۱۴) 'فاراب' نواح ترکستان میں آنروے دریائے سیحوں ایک شہر ہے۔ معلم ثانی شیخ ابونصر فارابی یہیں پیدا ہوئے۔ 'فاراب' اور شہر ہے سوائے 'فاریاب' کے جو باریاب کا معرب ہے اور خراسان میں واقع ہے۔ ظہیر فاریابی کا جو ایک نہایت مشہور شاعر ہے، وطن ہے۔

یہ حواشی پروفیسر اقبال احمد مجددی کے قلم سے ہیں۔

○○○

[۶]

فارسی زبان وادب

حضرات! پیشتر اس کے کہ میں باضابطہ اس رزولیوشن کی تائید کروں، میں چاہتا ہوں کہ ان دلائل پر جن کی وجہ سے فارسی الہ آباد یونیورسٹی کے تعلیمی کورس سے خارج کی گئی ہے غور کروں۔ اس قسم کی تجویز کے بانی مسٹر نیس فیلڈ (۱) تھے اور یہ تجویز وقتاً فوقتاً یونیورسٹی سینٹ میں پیش ہوا کی۔ فارسی کے مخالفین کے دو خاص دلائل ہیں۔ ایک تو یہ کہ فارسی ایک اختیاری مضمون ہے، جس کو طالب علم بجائے مشرقی کلاسیکل (یعنی عربی یا سنسکرت) کے لے سکتا ہے، جب تک کہ ان زبانوں کے کورس میں تفاوت رہے گا، ہرگز یہ امید نہیں ہو سکتی کہ طلبہ عربی یا سنسکرت کو لیں گے۔ یا ان زبانوں کے کورس کو فارسی کے آسان کورس پر ترجیح دیں گے۔ اس رزولیوشن کے لایق پیش کنندہ نے متذکرۂ بالا دلیل کا جواب دیا ہے اور رائے دی ہے کہ وہ تفاوت بالکل رفع ہو سکتا ہے، اگر فارسی کورس اتنا ہی مشکل کر دیا جائے جتنا کہ عربی یا سنسکرت کا کورس ہے اور اس کے پڑھنے اور یاد کرنے میں طالب علم کو اتنی محنت کرنی پڑے جیسی کہ ان دو زبانوں کے کورس میں کرنی پڑتی ہے۔ یہ بات کہ ''فارسی کورس کافی طور پر مشکل کیا جا سکتا ہے'' اس کورس سے جو کہ ہم نے حال میں طیار کیا ہے (۲)، عملی طور پر ثابت ہو گئی ہے اور اس میں ناکام طالب علموں کی تعداد اتنی ہی بڑھ گئی ہے جتنی کہ دوسرے مضامین میں ہوتی ہے، یہ بات اس کے مشکل ہونے کی ایک کافی شہادت ہے۔

دوسری دلیل بڑے غور سے دیکھنے کے لائق ہے۔ فارسی کے مخالفین کہتے ہیں کہ یہ کلاسیکل زبان نہیں ہے، اس لئے قوت متخیلہ کو تربیت دینے کی طاقت اس میں نہیں ہے، جیسی کہ دیگر زبانوں میں ہے۔ ایسے علم وادب سے پڑھیں جن میں قوت متخیلہ پوری طرح کام میں لائی جاسکتی ہے۔ اس کے لٹریچر میں علوم وفنون اور حقیقی شاعری نہیں ہے۔ لٹریچروں میں اس زبان کے لٹریچر کا رتبہ بالکل ادنیٰ ہے۔ مسٹر ماریسن (۳) کی تقریر کے بعد میرے لئے جو کام باقی رہا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس دوسری دلیل کو غلط ثابت کروں۔ ان تمام باتوں کو کہنے کے لئے جو اس بارے میں کہی جاسکتی ہیں، کم سے کم دو گھنٹے کی ضرورت ہوگی، اس لئے اس مختصر وقت میں جو مجھے ملا ہے، اپنے دلائل کو خلاصۃً بیان کروں گا۔ میں پہلے علوم وفنون کی جانچ کروں گا اور اس بات کو دیکھوں گا کہ آیا وہ علوم وفنون جو زبان عربی (جس کے علم اخلاق کی خوبی کے ہمارے مخالفین خود مقر ہیں) میں پائے جاتے ہیں، وہ زبان فارسی میں موجود ہیں یا نہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم کی تمام شاخیں جو عربی زبان میں ہیں، فارسی میں بھی موجود ہیں، اگرچہ کتابوں کی تعداد میں زبان فارسی عربی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، معانی و بلاغت کا ایک قابل قدر ذخیرہ زبان فارسی میں ہے۔ فلسفہ اور منطق میں سے ہر ایک کی ایک ایک مکمل تصنیف موجود ہے۔ درۃ التاج فلسفہ کی ایک عمدہ کتاب ہے۔ فارسی زبان میں شفاء ابن سینا کا ایک مفید خلاصہ موجود ہے، جس کا علم طب پر حاوی ہونا سب تسلیم کرتے ہیں۔ ابوریحان بیرونی کی تمام تصنیفات فارسی میں ہیں جو اس قدر کارآمد ہیں کہ عربی کے علماء کو بھی بعض اوقات ان کے حوالے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن زبان فارسی میں علم کی ایک شاخ ایسی ہے جو کہ صرف اسی زبان میں پائی جاتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے مشہور زمانوں کی بیش بہا تاریخ ہے۔ مجھے علم تاریخ کے فوائد بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم میں اس علم کا مفید ہونا ایک مسلم امر ہے۔ مشکل سے کوئی مشہور تاریخ عربی زبان میں ایسی ہوگی جو فارسی میں نہ ہو، لیکن چند

تاریخی تصنیفات زبان فارسی میں ایسی ہیں جو عربی میں نہیں ہیں۔ مثلاً شاہنامۂ فردوسی، جو فارس کے زمانۂ سلف کی ایک قابل اعتبار تاریخ ہے۔ اس حیرت انگیز کتاب کے سچے اور جھوٹے واقعات کو جدا کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ شاہ ضحاک کے خونخوار افعی اور سفید دیو وغیرہ کے قصے محض کتاب کی زینت کے واسطے ہیں، جو فردوسی کے زمانے کے اشخاص کے پسند خاطر تھے، لیکن اس کتاب کی اصل تہ سچے واقعات کی ہے، جو ان تاریخی معلومات پر جو دیگر ذرائع سے اس قدیم سلطنت کے بارے میں حاصل ہوسکتے ہیں، منطبق ہوجاتے ہیں۔ اس میں اس زمانے کے شہزادوں کی طرز تعلیم، ان کے حسب ونسب، ان کی کیفیتِ مزاج، ان کی حکومت کے حالات وغیرہ تاریخی ہیں، سرجان ملکم (۴) نے جن کو فارس میں عرصہ تک مقیم رہنے کا اتفاق ہوا تھا اور جنھوں نے بڑی تحقیقات کے بعد اپنی کتاب تصنیف کی ہے، فی الحقیقت ان معلومات میں جو کہ ہم کو فردوسی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں کوئی ضروری اضافہ نہیں کیا ہے۔ فردوسی کی تصنیف میں باطل مشرقی عقائد کو حذف کرنے کے بعد ایسے واقعات نہ پائے جائیں گے جو ملکم صاحب کی تاریخ سے مغائرت رکھتے ہوں۔ شاہنامہ میں ذکر ہے کہ جب کیکاؤس ماژندران گیا تو سحر کے زور سے دن رات میں تبدیل ہوگیا۔ ملکم اس واقعہ کے متعلق کہتا ہے کہ دوسری شہادت کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن چندر گرہن تھا۔ ہیرادوٹس (۵) جو یورپ میں ایک مسلم کلاسک ہے، رائج الوقت جانچ کو اس حد تک برداشت نہ کرسکے گا جتنا کہ شاہنامہ، جس کے بیانات غیر حقیقی اور پر از مبالغہ معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے دور بھی ہیں جن کے حالات فارسی ہی زبان میں ہیں۔ خاندان صفاری (۶) کے تاریخی حالات جو تیمور لنگ (۷) کا ہمعصر تھا، صرف فارسی میں ہیں۔ سلطنت مغلیہ کی تمام تاریخیں فارسی میں ہیں، جن کو اگر ہم علاحدہ کردیں تو ہمارے پاس چھ سو برس کے ملکی اور انتظامی حالات کی واقفیت کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔

فارسی میں ایک چیز اور بھی ہے جو عربی میں نہیں پائی جاتی اور جو انگریزی کے قبضہ میں بھی سو برس پیشتر تک نہ تھی، وہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریاں اور روزنامچے ہیں۔ میں نے جہانگیر کے عہد حکومت کے حالات کے بارے میں مختلف اشخاص کی بیسیوں تصنیفات دیکھی ہیں، لیکن کسی میں ایسی سچائی اور حقیقت کے ساتھ واقعات کا ذکر نہیں ہے، جیسا کہ تزک جہانگیری میں جو اس کی خود کی تصنیف ہے اور جس میں تاریخ کو ناول کے رنگ وروپ میں دکھایا گیا ہے۔ اس طرح سے یہ ظاہر ہے کہ فارسی میں علوم کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اب اس کی رنگینی عبارت دکھانا باقی ہے۔ میں اس موقعہ پر فارسی لٹریچر کے حصۂ نثر کو الگ رہنے دوں گا اور اس کے نظم کے حصوں کی جانچ کروں گا۔

کہتے ہیں کہ فارسی نظموں میں وہ آزادی کی روح نہیں ہے جو عربی زبان میں یہ تخصیص حاصل ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک جنگلی اور خانہ بدوش قوم کے چال چلن کو منعکس کرتی ہے جو ریگستان میں آزادی سے زندگی بسر کرتی ہے اور کسی کے تابعِ حکومت نہیں ہے، لیکن فارسی شاعری میں جس کی بنیاد اور ترقی بادشاہوں کے عہد حکومت میں ہوئی قدرتی طور پر ماتحتی اور چاپلوسی کی روح ہے۔ اس نقص کے علاوہ فارسی شاعری عربی شاعری کا نہایت عمدگی سے مقابلہ کرسکتی ہے اور بعض حالتوں میں اس سے بڑھ سکتی ہے۔ ہم یورپین علماء کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے ہم کو ایک نہایت عمدہ میدان فارسی کی تحقیقات کا بتلا دیا ہے جو قوت متخیلہ کو کافی ورزش دے سکتا ہے، وہ فارسی کے علم لسان کا علاقہ، سنسکرت اور یورپین زبانوں کے ساتھ جو آریہ قوم کی زبان سے تعلق رکھتی ہیں دریافت کرنے کا ہے۔ جرمن پروفیسروں کی اس مضمون پر بہت سی تصنیفات ہیں اور جس کا آغاز اس ملک میں سخندان پارس (۸) کی تصنیف سے ہوا ہے جو کہ ہمارے اردو لٹریچر کے عالی دماغ ہیرو پروفیسر محمد حسین آزاد کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ (۹)

تعلیقات وحواشی

(۱) نیس فیلڈ مسٹر نیس فیلڈ (John Nesfield,1836-1919) برطانوی مصنف، جس نے متعدد کتابیں لکھیں۔ان میں انگلش گرامر پاسٹ اینڈ پرزنٹ کو جو تین حصوں پر مشتمل ہے زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔۱۸۶۷ء میں ہندوستان آیا اور کرشنا نگر بنگال کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر ہوا۔کچھ دنوں تک اودھ میں انسپکٹر آف اسکول بھی رہا۔

(۲) علامہ شبلی نے الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی نصاب کی کتابیں مرتب کی تھیں۔ان کے نام انٹرنس کورس فارسی، ایف اے کورس فارسی اور بی اے کورس فارسی ہیں۔تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''آثار شبلی''، مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۲۰۱۳ء

(۳) مسٹر تھیوڈر ماریسن [۱۸۶۳-۱۹۳۶ء] پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ، کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے۔تحصیل علم کے بعد حکومت کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہوئے۔بعد ازاں ہندوستان آئے۔ اور ۱۸۸۹ء میں ایم اے او کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے۔پھر ۱۸۹۹ء میں پرنسپل بنائے گئے۔۵/ سال بعد مارچ ۱۹۰۵ء میں وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے تعلیمی معاملات ومسائل سے دلچسپی لیتے رہے۔فروری ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔

(۴) انگریز گورنر جنرل سر جان ملکم: (Sir John Malcolm,1769-1833) ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈپلومیٹ تھا۔اس نے تاریخ ہند پر کئی کتابیں لکھیں۔مورخ، مصنف اور سیاست داں کی حیثیت سے مشہور تھا۔ ۱۷۶۹ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۳۳ء میں انتقال کیا۔یہ ۱۸۱۰ء میں ایران گیا اور ۱۸۱۹ء میں اس نے تاریخ ایران لکھی۔سرسید احمد خاں نے تاریخ ایران کے بعض حصوں کا ترجمہ سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ سے شائع کرایا تھا۔

(۵) ہیروڈوٹس [پ: ۴۸۴ ق م۔وفات: ۴۲۵ ق م] قدیم یونانی مورخ جسے تاریخ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔اس نے یونانی زبان میں دنیا کی قدیم ترین تاریخ (The Histories) لکھی

ہے۔ یہ کتاب اس نے ۴۵۰ ق م اور ۴۲۰ ق م کے درمیان لکھی جو نو ابواب پر مشتمل ہے اور تمام ابواب کے نام تعلیم کی ۹ /دیویوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ اس میں اس نے بحیرۂ روم اور مغربی ایشیا کی ثقافتی روایات اور سیاسی نزاعات کا ذکر کیا ہے۔ نیز ہخامنشی سلطنت اور ان سے یونانیوں کی جنگوں کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ یونان سے لے کر سندھ، پنجاب، فارس اور متعدد ایشیائی علاقوں کی بھی سیاسی اور تمدنی واقعات بیان کئے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ مع تعلیقات وحواشی جناب یاسر جواد کے قلم سے نگارشات لاہور نے شائع کیا ہے۔

(۶) خاندان صفاری: سیستان کا ایک فارسی سنی خاندان تھا۔ اس نے ایران کے بعض حصوں پر ۸۶۱ء سے ۱۰۰۳ء تک حکمرانی کی۔ ان کا دارالحکومت زرنج تھا۔ یعقوب بن اللیث الصفار اس سلطنت کے بانی تھے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلی سلطنت تھی جو عباسیوں سے آزاد تھی۔ یہ فارسی تہذیب وتمدن کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ علم وادب اور فنون لطیفہ کے بڑے قدرداں تھے۔ محمد بن واصف السیستانی درباری شاعر تھے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد شعرا اور ارباب علم وکمال دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان تحقیق اور محققین کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔

(۷) امیر تیمور [۱۳۳۶-۱۴۰۵ء] جو عرف عام میں تیمور لنگ کہا جاتا ہے۔ اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین فاتحین میں ہوتا ہے۔ وہ ایک زبردست جنگ جو، فاتح اور سلطنت تیموریہ کا بانی تھا۔ چین سے لے کر بحیرہ روم تک کا علاقہ آن کی آن میں اس کے زیر نگیں ہو چکا تھا۔

تیمور سمرقند کے قریب ایک قصبہ ''کش'' میں پیدا ہوا جو اب ازبکستان میں واقع ہے۔ وہ ابتدا سے بڑا بہادر تھا۔ جنگوں میں مسلسل فتح وکامرانی حاصل کرتا ہوا وسط ایشیا پر قابض ہو گیا۔ اس کے قلمرو میں ترکستان، خوارزم، کاشغر، ہرات، خراسان، فارس، عراق، آذربائیجان، آرمینیا، میسوپوٹامیہ اور جارجیا وغیرہ شامل تھے۔ ۱۳۹۸ء میں اس نے ہمارے ملک ہندوستان پر بھی حملہ کیا اور محمود شاہ تغلق [۱۳۹۴-۱۴۱۴ء] کو شکست سے دوچار کیا۔ اس نے محمود شاہ تغلق کو صرف شکست ہی نہیں دی بلکہ دلی کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ یکے بعد دیگرے فتح نے اس کے حوصلے بلند کر دئے

تھے۔آخر میں چین کو بھی وہ فتح کرنا چاہتا تھااور اس پر ایک بڑے حملے کی زور وشور سے تیاری کر رہا تھا کہ ۱۹/ جون ۱۴۰۵ء کو اس نے دفعتاً انتقال کیا۔اس کی قبر سمرقند، از بکستان میں واقع ہے جو از بکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔

امیر تیمور لنگڑا تھا۔علامہ شبلی نعمانی کا اخیر عمر میں [۷۱رمئی ۱۹۰۷ء کو] بارود سے بھری ہوئی بندوق ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتے ہوئے ان کی بہو سے دب گئی اور گولی جا کے علامہ شبلی کے پنڈلی میں لگ گئی تھی۔اس وجہ سے ان کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا تھا۔مصنوعی پاؤں کے سہارے وہ ٹھہر ٹھہر کر چلتے تھے۔ایک قطعہ میں جو علامہ شبلی نے اکبرالہ آبادی [۱۸۴۶-۱۹۲۱ء] کے رقعہ دعوت کے جواب میں لکھا تھا،اس میں اپنے پاؤں کے کٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود کو تیمور سے تشبیہ دی ہے۔

(۸) سخندان پارس:محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب

(۹) ماہنامہ معارف،اعظم گڑھ،جنوری ۱۹۶۸ء

○○○

[۷]

علم کلام

سب سے پہلے میں نہایت ادب کے ساتھ عالی جناب صدر انجمن (۱) صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس جلسہ میں قدم رنجہ فرما کر میری عزت افزائی فرمائی اور پھر ان سب صاحبوں کا جو تکلیف کر کے یہاں تشریف لائے ہیں۔

حضرات آج کا میرا خطبہ (لکچر) علم کلام پر ہے، یعنی یہ کہ علم کلام کس علم کا نام ہے؟ وہ کب پیدا ہوا؟ کیونکر پیدا ہوا؟ اس سے کیا نتائج پیدا ہوئے؟

علم کلام کا ترجمہ انگریزی میں ''اسلام اینڈ سائنس'' کیا جاتا ہے۔ فرنچ تصنیفات میں اس کے لئے ''اسکولاسٹیک'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ الفاظ علم کلام کا مفہوم نہیں ادا کرتے۔

علم کلام کی تعریف

علم کلام کے معنی یہ ہیں کہ مذہب کے عقائد و مسائل کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جائے۔

علم کلام کی دو قسمیں ہیں

علم کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اندرونی یعنی جو اختلافات باہم مسلمانوں کے پیدا

ہوگئے اوران کے متعلق استدلالات اورمباحثات سے مسلمانوں میں بہت سے فرقے قائم ہوگئے تھے،جن کی تعداد تہتر (۷۳) تک پہنچتی ہے۔مثلاً معتزلہ،قدریہ، جبریہ،وغیرہ وغیرہ ان تمام مذاہب کے باہمی مناظرات کا نام بھی علم کلام ہے،لیکن میں اس وقت اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔

دوسراعلم کلام وہ ہے جو فلسفہ کے مقابلہ میں قائم ہوا اوراس وقت میری تقریر کا عنوان یہی علم کلام ہے،اس کی تاریخ نہایت دلچسپ ہےاوراس سے عجیب عجیب معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

علم کلام کی ابتدا

علم کلام کی ابتدا کی تاریخ یہ ہے کہ جب خلافت بغداد میں منتقل ہوئی تو منصورعباسی نے جو ہارون رشید کا دادا تھا، دنیا کی تمام قوموں کی علوم وفنون کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرائیں،اس غرض کے لئے دنیا کے ہر حصہ سے علما اور مترجمین دربارِخلافت میں جمع کئے اوران کونہایت بیش بہا صلے اورانعامات دئے چنانچہ میں نے اپنے ایک رسالہ میں ان واقعات کو بالتفصیل لکھا ہے،اس وقت تفصیلاً بیان کرنے کا موقع نہیں۔(۲)

جب ان علوم کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو اس کے پڑھنے سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں شبہات اورشکوک پیدا ہوئے۔یہاں تک کہ مہدی کے زمانہ خلافت میں جو منصور کا بیٹا تھا بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوئے جو مانی کے پیرو ہوگئے۔(یہ مجوسیوں کا ایک مشہور پیشوا اورایک خاص فرقہ کا بانی تھا) چنانچہ حماد، عجرد وغیرہ نے اس مذہب کی حمایت میں کتابیں لکھیں، یہ حالت اس کی مقتضی تھی اور ممکن بھی تھا کہ ان لوگوں کوسزادی جاتی یا ان کی زبانیں بند کردی جاتیں یا ترجمہ کا سلسلہ روک دیا جاتا،لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کسی صدمہ سے اسلام کوضررنہیں ہوسکتا اورکوئی بادِصرصر اسلام کو

صدمہ نہیں پہونچا سکتی (چیرز) اس لئے خلیفہ مہدی نے روک ٹوک کے بجائے حکم دیا کہ اسلام کے اثبات اور دیگر مذاہب کے رد میں کتابیں لکھی جائیں۔ یہ علم کلام کے وجود کا پہلا دن تھا۔

علم کلام کی ابتدااوراس کی وجہ تسمیہ کے متعلق ابن خلکان وغیرہ کی غلطی

بعض مورخین کا بیان ہے کہ اس سے پہلے علم کلام پیدا ہو چکا تھا، جس کا بانی واصل ابن عطا تھا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ

''چونکہ علم کلام کی پہلی بحث کلام الٰہی کے متعلق تھی اس لئے اس کا نام علم کلام رکھا گیا۔''

لیکن یہ غلطی ہے۔ علم کلام درحقیقت مہدی کے زمانہ میں پیدا ہوا۔ اور جیسا کہ شہر ستانی نے ''ملل ونحل'' میں لکھا ہے، علم کلام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس علم کو منطق وفلسفہ کا ہم پلہ قرار دیا تھا۔ اور منطق وکلام ہم معنی الفاظ ہیں۔

علم کلام کا سب سے پہلا مصنف

اول شخص جس نے علم کلام پر کتاب لکھی ابوالہذیل علاف تھا۔ (۳) علاف کے معنی ''گھانس بیچنے والا'' ہے۔ اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں کوئی پیشہ معیوب نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء ایسے گذرے ہیں جو موچی یا لوہار وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ علماء کو امرِ حق کے ظاہر کرنے میں عوام کی کچھ پروانہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان کا ذریعۂ معاش عوام کی نذر ونیاز پر موقوف نہ تھا۔ آج کل کے علماء جو بالکل عوام کی مرضی کو دیکھتے رہتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر عوام برگشتہ ہو جائیں تو علماء کے وسائلِ معاش میں فرق آجائے۔ اس سے آپ یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں

اس زمانہ میں علم تھا۔ یہاں تک کہ موچی اور لوہار وغیرہ بھی بڑے بڑے اہلِ کمال ہوتے تھے۔افسوس ہے کہ اب حالت برعکس ہے۔

بہرحال ابوالہذیل علاف پہلا شخص تھا جس نے علم کلام پر کتاب لکھی۔اس نے بہت سے مناظرات کئے اور ان کا یہ اثر ہوا کہ تین ہزار آدمی اس کی زورتقریر سے مسلمان ہوگئے۔نہ کہ تلوار سے یا خوف سے یا دباؤ سے۔(چیرز)

ایک مجوسی میلاس نامی بہت سے مجوسیوں کو ساتھ لیکر آیا اور کئی دن تک ابوالہذیل سے مناظرہ کرتا رہا۔انجام کار اس نے اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ قبول اسلام کیا۔(۴) (چیرز)

نظام

دوسرا شخص نظام تھا جس نے اس علم کو بہت ترقی دی۔چونکہ اس علم کی تکمیل کے لئے فلسفہ وعقلیات سے نہایت اعلیٰ درجہ کی واقفیت درکار تھی،اس لئے نظام نے یونانی فلسفہ میں نہایت مہارت حاصل کی، یہاں تک کہ جب ایک مرتبہ اس نے ایک برمکی سے کہا کہ آج کل میں ارسطو کی کتاب ''الطبایع'' کا رد لکھ رہا ہوں اس نے کہا ارسطو کی کتاب تم نے دیکھی بھی نہ ہوگی، ردّ کیا لکھو گے،تو نظام نے جواب دیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں ''میں آپ کے سامنے اس کتاب کے اول سے آخر تک پڑھ جاؤں یا آخر سے اول تک۔''(۵)

ہارون الرشید نے علم کلام کی تصنیفات کو روک دیا

مہدی کے زمانہ میں یہ حالت رہی،مگر ہارون رشید نے جو یورپ میں الف لیلہ کی وجہ سے بہت مشہور ہے،حکم دیا کہ کوئی شخص علم کلام پر کچھ نہ لکھنے پائے،اس وجہ سے اس قسم کی تصنیفات بالکل بند ہوگئیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر قوموں نے طعنے دینے شروع کئے کہ

اسلام دلائل اور براہین سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ مامون الرشید کے زمانہ تک یہ بدنامی عام ہو چکی تھی۔

مامون الرشید کا علم کلام کو دوبارہ زندہ کرنا

چنانچہ اس کے رفع کرنے کے لئے مامون الرشید نے حکم دیا کہ ایک عام مجلس مناظرہ قائم کی جائے، جس میں تمام دنیا کے پیشوایانِ مذہب بلائے جائیں، اور ہر شخص کو بحث و گفتگو کی عام اجازت دی جائے۔ اس زمانہ میں مجوسیوں کا پیشوائے مذہب یزداں بخت تھا، چنانچہ وہ رے سے طلب ہوکر آیا، اس کے سوا اور تمام پیشوایانِ مذہب ہر جگہ سے طلب کئے گئے اور مسلمانوں کی طرف سے بحث کرنے کے لئے نظام کا انتخاب کیا گیا، اس معرکہ میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔(۶)

علم کلام سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا اندازہ

علم کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ جو چیز قابلِ خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے تعصبی اور فراخ حوصلگی ہے، جو کتابیں غیر مذہب والوں نے اسلام کے خلاف لکھی ہیں، میرا خیال ہے کہ آج اگر وہ موجود ہوں تو جلا دی جائیں، لیکن اس وقت جبر یہ روک ٹوک نہیں کی گئی، بلکہ دلائلِ عقلیہ سے ان کو باطل ثابت کیا گیا جس سے وہ خود ناپید ہوگئیں۔

ایک اور امر حیرت انگیز یہ ہے کہ تاریخوں میں یہ واقعات تو ملتے ہیں کہ مسلمان علماء وفقہاء نے بادشاہان اسلام کے ہاتھ سے تکلیفیں اٹھائیں، مثلاً امام ابوحنیفہؒ وامام مالکؒ وغیرہ نے قیدیں بھگتیں اور تازیانے کھائے لیکن ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں کہ کسی غیر مذہب کے عالم کو اسلامی حکومت میں کچھ تکلیف پہونچی ہو۔ سلسلۂ بیان میں مجھے ایک بات یاد آ گئی اور خواہی نخواہی کہنا پڑتا ہے کہ میری کتاب الفاروقؓ جب شائع ہوئی تو مسٹر آرنلڈ نے جو

ہمارے کالج کے پروفیسر ہیں اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا اور لندن میں ''ہیروز'' کے سلسلہ میں داخل کرانے کی تحریک کی، چنانچہ اڈیٹر سے اس معاملہ میں خط و کتابت کی، دو مہینے کے گذرنے پر جواب ملا کہ ایک ایسی کتاب کا چھاپنا جو ''فاروق ؓ'' کے حالات میں ہے، ''ہماری پالیسی کے خلاف ہے''۔ حالانکہ اڈیٹر نے کتاب مذکور کو آنکھ سے دیکھا تک نہ تھا۔

اس کے مقابلہ میں یہ واقعہ لحاظ کے قابل ہے کہ مامون الرشید کے زمانہ میں یعقوب کندی نے ایک مسلمان رئیس کو اسلام کے متعلق جو خط لکھا اور جس میں نہایت گستاخی سے اسلام پر حملے کئے، مامون الرشید کے سامنے جب وہ خط پیش ہوا تو اس نے صرف یہ کہا کہ مذہبی خیال میں کسی پر جبر نہیں ہوسکتا، لا اکراہ فی الدین. چیرز

طرہ یہ کہ یورپ والے باوجود اس کے ہم مسلمانوں کو متعصب اور تنگ خیال کہتے ہیں۔

مسلمانوں کی بے تعصبی، روشن ضمیری، فراخ حوصلگی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے غیر قوموں کے علوم وفنون کے ساتھ وہی محبت اور دلچسپی ظاہر کی جو ان کو خود اپنے ذاتی علوم وفنون کے ساتھ تھی۔ وہ یونانی طب کو اپنا علم طب سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ آج ہمارے ہاں کے قدیم حکیموں سے جب کہا جاتا ہے کہ طب یونانی کی بہت سی غلطیاں ثابت ہوئیں تو وہ لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں، گویا یہ علم خود انہی کا اور ان کے مورثوں کا علم ہے۔

درسِ نظامیہ میں جس قدر کتابیں منطق اور فلسفہ کی شامل ہیں اتنی خاص اسلامی علوم کی نہیں ہیں۔ تفسیر وفقہ کی صرف چند کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، لیکن منطق وفلسفہ کا یہ حال ہے کہ صغریٰ وکبریٰ سے شمسِ بازغہ تک ان کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی بے تعصبی اس قدر بدیہی واقعہ تھا کہ یورپ مشکل سے اس کا انکار کرسکتا تھا، اس لئے یورپ نے بجائے اس کے ایک دوسرا اعتراض قائم کیا اور وہ یہ کہ

مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی۔ مسٹر ڈریپر نے لکھا ہے کہ ''مسلمان درحقیقت ارسطو کی گاڑی کے قلی ہیں۔''

یورپ کے اس اعتراض کا جواب کہ مسلمانوں نے فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی:

افسوس یہ ہے کہ یورپ نے ہمارے علم کلام کی کتابیں نہیں پڑھیں ورنہ وہ دیکھتا کہ ہم ارسطو کے فلسفہ کو ہیچ سمجھتے تھے اور ہم نے دلائل سے اس کو ہیچ ثابت کیا تھا۔ آپ کو سخت حیرت ہوگی کہ منطق جو ایک ایسا یقینی علم ہے جیسے کہ گرائمر اور اس کا رد بظاہر ممکن نہیں۔ مسلمانوں نے نہایت باریک بینی سے اس پر نکتہ چینی کی، علامہ ابن تیمیہؒ کی کتاب الرّد علی المنطقین جو کئی سو صفحوں میں ہے، آج کل میرے استعمال میں ہے، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر اس کا ترجمہ یورپ میں شائع کیا جائے تو یورپ کی آنکھیں کھل جائیں۔

فلسفہ کے خلاف مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور دو حیثیت سے لکھا ہے۔ اول یہ کہ وہ مسئلہ فلسفہ کی حیثیت سے صحیح ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ مذہب کے مسائل سے مطابق ہے یا نہیں۔ مثلاً فلاسفر کہتے ہیں کہ خدا خود اپنے اختیار سے کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ بلا اختیار تمام افعال اس سے سرزد ہوتے رہتے ہیں جس طرح آفتاب سے بلا اختیار روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد کے خلاف تھا، اس لئے علم کلام میں اس کو نہایت قوی دلائل سے باطل ثابت کیا گیا۔

اس طرح اور بہت سے عقائد تھے اور ان تمام مسائل میں مسلمانوں نے ارسطو کی غلطیاں ثابت کیں۔ یہ علم کلام کا ایک نہایت مختصر نمونہ اور اس کی تاریخ ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ آج کل ہم کو مذہب کی حفاظت کے لئے علم کلام کی ضرورت ہے یا نہیں اور ہے تو وہی

قدیم علم کلام کافی ہے یا ایک دوسرا علم کلام درکار ہے۔

آج کل علم کلام کی ضرورت ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کی حفاظت کے سامان کی آج کل جس قدر ضرورت ہے کبھی کسی زمانہ میں نہ تھی۔ قدیم زمانہ میں اولاً تو تربیت کا ایسا طریقہ تھا جو خود مذہب کی حفاظت کے لئے کافی تھا، ایک مسلمان بچہ جب مکتب میں بیٹھتا تھا تو اس کو اس کا استاد مذہب کی مجسم تصویر نظر آتا تھا۔ بچہ کی ناروا باتوں پر ناجائز، منع، حرام، مکروہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے اور یہ مختصر الفاظ فقہ کے بڑے بڑے مفصل احکام کا کام دیتے تھے، غرض چونکہ ابتدا ہی سے بچے مذہبی قالب میں ڈھالے جاتے تھے، اس لئے جوان ہو کر وہ بالکل مذہبی بن جاتے تھے۔

اگر شاذ و نادر فلسفہ وغیرہ کے اثر سے مذہب میں تزلزل پیدا ہوتا تھا تو علم کلام کی بے شمار تصنیفات موجود ہوتی تھیں لیکن آج دو باتوں میں سے ایک بھی نہیں۔

تربیت تو اس لئے نہیں کہ اسکولوں اور مدرسوں میں مذہبی پابندی اور مذہبی خیالات کا نام نہیں لیا جا سکتا، جو گورنمنٹ ہم پر حکومت کر رہی ہے، اس کی رعایا میں مختلف مذاہب کے لوگ داخل ہیں اور اس لئے وہ کسی مذہب کی تخصیص نہیں کر سکتی اور درحقیقت اس کو کرنا بھی نہیں چاہئے۔ اسی ضرورت کے لئے مسلمانوں نے علی گڑھ میں اپنا مدرسہ الگ قائم کیا اور اگر یہ ضرورت اس مدرسہ سے انجام پا جائے تو دنیا میں کوئی چیز مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ مفید نہیں ہو سکتی۔

قدیم علم کلام کا آج کل ناکافی ہونا۔

علم کلام کا یہ حال ہے کہ قدیم علم کلام جو طیار ہوا تھا وہ فلسفۂ قدیم کے مقابلہ میں

تھا۔ اب سینکڑوں نئے مسائل پیدا ہو گئے جن سے مسلمانوں کے عقائد پر اثر پڑتا ہے اور ان کے دفعیہ کا کوئی سامان نہیں۔ مصر و شام میں بعض علماء نے نیا علم کلام مرتب کرنا چاہا۔ مثلاً حسین جر جس نے حمیدیہ نامی کتاب لکھی۔ ایک اور مصنف نے ''الدلیل الصادق'' ایک بڑا رسالہ لکھا۔ لیکن چونکہ یہ علمائے یورپ کے علوم سے بالکل نا آشنا ہیں اس لئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں بے سر و پا لکھتے ہیں۔

ایک بڑے عالم صاحب نے فرمایا کہ خوردبین میں شیشوں سے جو کچھ نظر آتا ہے اور جس کی بنا پر یورپ والے آسمان وغیرہ سے انکار کرتے ہیں، وہ واقعی نہیں ہوتا بلکہ صرف شیشہ کا اثر ہے۔ جس طرح سبز عینک سے تمام چیزیں سبز نظر آتی ہیں اور سرخ سے سرخ۔ آج کل جو لوگ نیا علم کلام مرتب کرنا چاہتے ہیں ان میں صرف ایک شخص فرید وجدی بک ہے جو فرنچ زبان کا بڑا ماہر ہے۔ اس نے اسلام کے ثبوت میں متعدد تصنیفات لکھی ہیں اور نہایت مدلل لکھی ہیں۔ وہ ایک ماہوار رسالہ بھی نکالتا ہے، جس میں علم کلام کی بحثیں ہوتی ہیں۔

اس قابل مصنف کے نمونہ پر میں نے ایک نہایت مفصل کتاب لکھنی شروع کی ہے، جس کے دو حصے قرار دئے ہیں۔ پہلے حصہ میں قدیم علم کلام کی نہایت مفصل تاریخ اور اس پر ریویو ہے۔ دوسرے حصہ میں جدید علم کلام کے مسائل ہیں۔

اس دوسرے حصہ میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا ہے کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، پھر نہایت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے کہ تمام مذاہب موجودہ میں اسلام کو کیا ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ اس موقع پر میں اپنی کتاب کے چند صفحے آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں۔

مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے

اس نکتہ کے سمجھنے سے پہلے انسان اور حیوان کا مقابلہ کرو۔ حیوان اپنی تمام

ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔اس کا لباس ان کے ساتھ ہوتا ہے، جو موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجہ، ناخن، ڈنک کے ہتھیار ان کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جن غذاؤں پر اس کی زندگی کا مدار ہے۔ پیدا ہونے کے ساتھ اس کو ہر طرف جنگل ہو یا پہاڑ، خشکی ہو یا دریا، ویرانہ ہو یا آبادی ہر جگہ مہیا ملتی ہے۔انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اس کے پاس مہیا نہیں ہوتا، اس کی جلد نازک ہوتی ہے، ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں، جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا، دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے۔اس کے ساتھ عالمِ فطرت کی جتنی چیزیں اس کے گردو پیش ہوتی ہیں، سب کی سب اس کی دشمن نظر آتی ہیں۔آفتاب کی گرمی، بادلوں کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ، جاڑوں کی ٹھنڈ ہر چیز چاہتی ہے کہ اس کو تباہ کردے۔ یہ معنی ہیں قرآن کی اس آیت کے "خلق الانسان ضعیفا".

ان مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی مادی ہتھیار نہیں دیا کیونکہ جن بے شمار اور پرزور دشمنوں کو اس کا سامنا کرنا تھا، اس کے لئے کوئی مادی آلہ کافی نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے قدرت نے اس کو مادی ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی جس نے ہر مخالف کے مقابلہ کا جدا سامان تیار کیا، دھوپ، گرمی، جاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیغ وخنجر طیار کئے۔ دریاؤں پر پل باندھے۔ پہاڑ تراشے۔لوہا پگھلایا۔ برق کو مسخر کیا۔ ہوا کو تھاما۔غرض تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اس کے پنجۂ اقتدار میں تھی۔ اس عام قوت کا نام عقل کُلّی یا عقلِ انسانی ہے۔

لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر ٹھہرنے نہ پائیں، اس لئے وہ (یعنی قدرت) ایک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے، جس سے ہر انسان پر نئے نئے طرح کے

حملے کئے جاتے ہیں۔جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو چکا تھا ان کے علاوہ نئے امراض پیدا ہوتے ہیں۔دنیا کا جغرافیہ جس قدر دریافت ہو چکا تھا،اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہےاور وہاں نئی ضروریات پیش آتی ہیں۔آرام وآسایش کے جو سامان ہو چکے تھے،راحت طلبی کا مادہ بڑھ کر وہ سامان بےکار ہو جاتے ہیں۔مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کے لئے نئی طیاریاں (ے) کرتا ہےاور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔عالمِ کون اور انسان کی یہی باہمی کشمکش وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے اور جس کی بدولت آج یورپ میں سینکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قائم ہےاور روز بروز بڑھتا جاتا ہے،لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے زیادہ بحث اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک گروہ ہے جو خود انسانوں کے اندر موجود ہے،اور جن سے انسان کو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں۔طمع اس کو آمادہ کرتی ہے کہ عزیز و بیگانہ،دوست و دشمن، دور و نزدیک کی تمام دولت و مال پر قبضہ کر لیا جائے۔کینہ پروری کا تقاضا ہے کہ مخالفوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔جاہ طلبی کہتی ہے جب تک تمام عالم کی گردنیں جھک نہ جائیں آرام نہ لے،ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک یہی عقل کام آتی ہے۔وہ بتاتی ہے کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کرو گے،تو وہ بھی کرے گا،تم کسی کو برباد کرنا چاہو گے تو وہ بھی چاہے گا،تم دوسروں کی عزت نہ کرو گے تو وہ بھی نہ کریں گے؟لیکن اول تو اس قسم کی پیش بیں اور انجام اندیش عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہو سکتی ہے۔اس کے علاوہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں جہاں اس قسم کے مساویانہ انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔حکومت کا خوف، جاسوس کا ڈر، بدنامی کا احتمال، انتقام کا خطرہ، ایک بھی چیز نہیں ہوتی۔ان موقعوں پر عقل ان پرزور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ ایک دوسری قوت ہے جو سینہ سپر ہوتی ہےاور انسان کو ان دشمنوں کے حملہ سے بچاتی ہےاس قوت کا نام نورِ ایمان، کانشنس،حاسۂ اخلاقی ہےاور یہی مذہب ہے۔

یہ قوت اس کی اصل فطرت میں داخل ہے۔ عالم و جاہل، رزیل و شریف، شاہ و گدا، افریقہ کا وحشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہی معنی ہیں قرآن کریم اس کی آیت کے ہیں:

''فاقم وجھکَ للدّین حنیفاً فطرة اللّٰہ الّتی فطرالناس علیھا، لا تبدیل لخلق اللّٰہ ذلک الدّین القیم و لکن اکثر النَّاسَ لا یعلمون.(روم. ۳۰) (۸)

جرمن کا ایک حکیم لکھتا ہے کہ

''مذہب ابدی چیز ہے، کیونکہ جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں کبھی معدوم نہیں ہوسکتا۔''

فرانس کا مشہور فاضل معلم رینان اپنی کتاب ''تاریخ مذہب'' میں لکھتا ہے:

''یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیا جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محبوب ہوسکتی ہیں مٹ جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہوجائے، یا اس کی قوت میں زوال آجائے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا اعلانیہ ثبوت دے گا کہ مادی مذہب (میٹریلزم) بالکل غلط ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے۔''

پروفیسر سیسٹر'' فلسفۂ دینیہ'' میں لکھتا ہے:

''میں کیوں پابند مذہب نہ ہوں، اس لئے کہ اس کے خلاف میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے۔ میں نے خود اپنی رائے پر یہی اعتراض کیا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا؟ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو

اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے، اس سے زیادہ تمام انسانی سوسائٹی کو ہے، مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالی گئی ہیں لیکن یہ جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے، اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کر لئے ہیں، اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہوسکتی، مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور زیادہ گہرا کرتے جاتے ہیں، انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوتی ہے اور اسی سے قوت پائے گی۔''

دنیا افرادِ انسانی کی خاص خاص مختصات یعنی زبان، قوم، ملک، صورت، رنگ کو حذف کرتے جاؤ تو جو چیزیں مشترک رہ جائیں گی ان میں ایک مذہب ہوگا اور یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مذہب فطری چیز ہے جب چیزوں کی کمی ہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں، مثلاً اولاد کی محبت، انتقام کی خواہش، کمال کی قدردانی، ان کے فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم، ہر طبقہ، ہر نسل، کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب انسان کی فطری چیزوں میں شمار نہ کیا جائے، صرف اسی قدر نہیں بلکہ مذہب کے جو مقدم اصول ہیں، وہ تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں، خدا کا وجود، اس کی پرستش کا خیال، حیات بعد الموت، اعمال کی جزا و سزا، رحمدلی، ہمدردی، عفت کو اچھا سمجھنا، جھوٹ، دغا، زنا، چوری کو برا جاننا، تمام دنیا کے مذہبوں کا اصل اصول ہے۔

فطرت نے افرادانسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے، دولت و مال، جاہ و حشم، فضل و کمال، ذہن و ذکا کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ سکندر و تیمور، ارسطو و افلاطون، ہومر و فردوسی اسی فیاضی کے نمونے ہیں، دوسری طرف یہ بخل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا کم فرق رہ جاتا ہے کہ ڈارون کو نظر بھی نہیں آتا۔

بااین ہمہ جو باتیں شرط زندگی اور مدار حیات ہیں وہ تمام افرادانسانی کو یکساں عطا کی ہیں۔ افریقہ کا جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا، پیتا، چلتا، پھرتا، سوتا، جاگتا، بولتا چالتا ہے جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کو انجام دیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے، لازمۂ انسانی تھا اور اس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں کو یکساں عطا کیا۔ ارسطو اور ملتھم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے کہ سچائی، دیانت داری، عفت، حلم، اچھی چیزیں ہیں، لیکن افریقہ کا ایک وحشی بغیر تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے خود بخود ان چیزوں کو اچھا جانتا ہے اور اچھا سمجھتا ہے۔

ان تمام باتوں سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ نفس مذہب اور مذہب کے مقدم اصول فطری چیزیں ہیں جو انسان سے جدا نہیں ہوسکتیں اور جو لوگ اس سے الگ ہونا چاہتے ہیں، وہ گویا اصول فطرت کو توڑنا چاہتے ہیں۔

علامہ شبلی نے یہاں تک تقریر کرنے کے بعد کہا کہ ''افسوس میں بالکل تھک گیا اور اس وجہ سے اس مضمون کا وہ حصہ جس میں خاص مذہب اسلام کی صحت اور ترجیح کا ذکر ہے نہیں پڑھ سکتا۔''

(ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۹ء)

تعلیقات و حواشی

(۱) یعنی عالی جناب نواب مشیر الدولہ فخر الملک بہادر وزیر عدالت دام مجدہٗ

(۲) اس رسالہ سے مراد علامہ شبلی کی کتاب ''علم الکلام'' ہے، جو اولاً مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی۔ غالباً ۱۹۰۱ء میں (اس مضمون کو لکھنے کی تاریخ) تک اس کا دوسرا حصہ ''الکلام'' شائع نہیں ہوا ہوگا، اس لئے یہاں حصہ اول کو ''رسالہ'' لکھا گیا ہے۔

(۳)　''ابوالہذیل'' کا پورا نام محمد بن الہذل بن عبداللہ بن مکحول ہے۔۱۳۱ھ میں پیدا ہوا اور ۲۳۵ھ میں وفات پائی۔ (ملاحظہ ہو علم الکلام ص ۳۵ طبع آگرہ)

(۴)　ابن خلکان تذکرہ ابوالہذیل علاف

(۵)　نحل و نمل۔ابن مرتضی زیدی

(۶)　اس مناظرہ کا ذکر ابن الندیم نے اجمالاً اور یحیٰی زیدی نے ملل و نحل میں تفصیلاً کیا ہے۔

(۷)　تیار اور تیاریاں، اس لکچر میں ہر جگہ ''ت'' کی بجائے ''ط'' سے لکھا گیا ہے، مولانا شبلی مرحوم کی دیگر کتابیں جو ان کی زندگی میں شائع ہوئیں، یہ الفاظ اسی طرح چھپے ہیں، نیز اردو کی بعض قدیم کتابوں میں بھی تیار کو طیّار لکھا گیا ہے۔ (محمد اقبال مجدّدی)

(۸)　یہ نکتہ تیرہ سو برس کے بعد اب یورپ کے حکماء کے خیال میں آیا۔

ooo

[۸]

ندوۃ العلماء کی ضرورت

حضرات!

ندوۃ العلما کے جلسے میں جو سب سے زیادہ ضروری مضمون ہے وہ خود ندوۃ العلما کی ضرورت کا ظاہر کرنا ہے۔ آج تک ندوہ کے جتنے سالانہ اجلاس ہوئے سب میں اس ضرورت کا لحاظ رکھا گیا اور اس مضمون پر پرزور تقریریں کی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ندوہ کی تمامتر کامیابی کا مدار اسی پر ہے کہ یہ مسئلہ پوری طرح سے حل کر دیا جائے۔

ندوہ جب اول اول قائم ہوا تو قدیم اور جدید گروہ نے اس کو حیرت اور تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ قدیم گروہ کا خیال تھا کہ اگر ندوہ کا مقصد علوم قدیمہ کو ترقی دینا ہے تو ہندوستان میں آج سیکڑوں عربی مدارس موجود ہیں جو اس مقصد کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ جدید گروہ کہتا تھا کہ بڑی مشکل سے اور بڑی ہائے پکار سے مسلمان خواب غفلت سے چونکے تھے اور جدید تعلیم کی طرف مائل ہوئے تھے۔ کیا ندوہ کی یہ خواہش ہے کہ ترقی کی جس حد تک ہم پہونچ گئے تھے اس سے ہٹ کر پھر پہلے مرکز پر آ جائیں اور قدیم تعلیم کے جس شکنجے میں ہم گرفتار تھے دوبارہ پھر اس میں پھنس جائیں۔

اس قسم کا استعجاب جو ندوہ کے متعلق ظاہر کیا گیا کوئی نئی بات نہ تھی۔ دنیا میں ہمیشہ جب کوئی نئی تحریک ہوئی ہے تو زمانہ نے اسی طرح حیرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اسلام کا

سب سے بڑا ضروری کام قرآن کا جمع کرنا تھا، لیکن اول اول جب حضرت عمرؓ کے دل میں یہ خیال آیا تو حضرت ابوبکرؓ اور خود کاتب وحی نے اس ارادے پر سخت حیرت ظاہر کی اور کہا کہ جو کام جناب رسول اللہؐ نے نہیں کیا دوسرا شخص اس کے کرنے کی کیونکر جرأت کرسکتا ہے، لیکن بالآخر سب نے اسی کام کو ضروری سمجھا اور اس کو انجام دیا۔

اسی طرح فقہ، حدیث، اسماء الرجال، علم کلام کی بنیاد قائم ہوئی اور ان میں سے ہر علم کے قائم ہونے کے وقت ابتدا میں مخالفت کی گئی۔

اب میں دونوں گروہوں کی طرف الگ الگ خطاب کرتا ہوں۔ قدیم گروہ کا یہ خیال کہ مدارس موجودہ میں علوم قدیمہ کی تعلیم کافی طور سے ہورہی ہے اس لئے ندوے کی کیا ضرورت ہے صحیح نہیں۔ ندوہ کا مقصد صرف علوم قدیمہ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں جتنے علم پیدا ہوئے سب زمانے کی خاص خاص ضرورتوں سے پیدا ہوئے۔ مثلاً علم کلام صرف اس ضرورت سے پیدا ہوا تھا کہ فلسفہ یونان کی تعلیم نے لوگوں کے مذہبی خیالات متزلزل کر دیے تھے اس بنا پر آج بھی چونکہ فلسفۂ جدیدہ کی تعلیم نے ہزاروں آدمیوں کو مذہب کی طرف سے بے دل کر دیا ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے میں ایک نیا علم کلام ایجاد کیا جائے۔ نہ صرف اسی قدر بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جس طرح ہمارے قدمانے یونان، مصر، ایران اور ہندوستان کے علوم وفنون اپنی زبان میں منتقل کئے تھے اسی طرح یورپ میں جو نئے علوم وفنون ایجاد ہوئے ہیں ہماری زبان میں منتقل کئے جائیں۔

اس موقع پر مجھ کو ایک عالم گیر غلطی کا رفع کرنا ضرور ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ ہمارے علما انگریزی تعلیم تعصب کی وجہ سے نہ خود حاصل کرتے ہیں نہ دوسروں کو اجازت دیتے ہیں۔ اس دعوے کا اس قدر حصہ تو بدیہی اور حقیقت واقعی ہے کہ علماء انگریزی تعلیم سے بالکل الگ ہیں لیکن بحث طلب یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا جیسا کہ عام خیال ہے

اس کی وجہ تعصب ہے؟ اگر تعصب ہی ہے تو ہمارے علما جن علوم وفنون کی تعلیم میں دن رات مشغول ہیں اور جس کو وہ اپنا مایۂ ناز سمجھتے ہیں کیا وہ اسلامی علوم ہیں؟ منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت یہ وہ علوم ہیں جن کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے علما کی تمام عمر صرف ہوتی ہے اور علما ان علوم کو اسی شوق اور محنت اور سرگرمی سے سیکھتے ہیں جس طرح خالص مذہبی علوم مثلاً تفسیر اور فقہ اور حدیث کو پس جبکہ ہمارے علما نے تمام غیر قوموں کے علوم وفنون کے حاصل کرنے میں اس قدر بے تعصبی اور فیاض دلی ثابت کی ہے تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی علوم وفنون کے حاصل کرنے میں اس قدر بے تعصبی اور فیاض دلی ثابت کی ہے اور کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی علوم وفنون کے سیکھنے سے ان کو تعصب نے باز رکھا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ علما نے انگریزی تعلیم کا جو نمونہ دیکھا اور اس تعلیم کا جو سرسری تجربہ ان کو ہوا اس نے ان کو یقین دلا دیا ہے کہ انگریزی زبان میں دقیق علوم اور نازک مسائل کا وجود نہیں بلکہ صرف سرسری اور عامیانہ باتیں ہیں جو درس وتدریس کے قابل نہیں۔ جغرافیہ، زمین کے نقشے، جانوروں کا حال، معمولی تاریخی واقعات، نجاری اور حدادی وغیرہ یہی انگریزی کی کل کائنات ہے۔

علماء کا یہ خیال اگرچہ بالکل غلط ہے لیکن اس میں منشاء انتزاع ضرور ہے، انگریزی خوانوں کا جو گروہ ملک میں موجود ہے اس سے ایک ناواقف شخص اور کیا قیاس کر سکتا ہے؟ آج ملک میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں انگریزی اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن کیا ان میں ایک بھی فلسفہ دان ہے؟ منطقی ہے؟ شاعر ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو اس نمونے کو دیکھ کر ہمارے علما اور کیا قیاس کر سکتے تھے؟ بہت بڑی چیز جو علم کا معیار ہے وہ علمی ذوق ہے، ہمارے علما علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ انگریزی خوان جماعت میں علمی ذوق بالکل مفقود ہے یعنی ایک شخص بھی علم کو علم کی غرض سے نہیں پڑھتا یہاں تک کہ اگر گورنمنٹ کی طرف سے نوکریوں کے لئے انگریزی دانی کی قید اٹھالی جائے تو اس سرے سے اس سرے تک تمام

اسکول اور کالجز دفعۃً خالی ہو جائیں گے؟ اس سے ایک ناواقف شخص خواہ مخواہ یہ قیاس کرے گا کہ انگریزی میں دقیق، لطیف، نازک اور دلچسپ مسائل علمی نہیں ہیں ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک مدت تک مشغول رہنے کے بعد ایک شخص کو بھی علمی ذوق نہ پیدا ہوتا۔

اس بنا پر ہمارے علما کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس زبان میں بھی علوم وفنون لطیفہ موجود ہیں۔

اب میں علما سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ یورپ میں بہت سے ایسے علوم وفنون ہیں کہ ہمارے ہاں ان کا نام ونشان نہیں ملتا۔

خود ہمارے فن ادب میں بھی یورپ والوں کا قدم ہم سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ لغت میں ہمارے یہاں سب سے جامع تصنیف علامہ مجدالدین فیروزآبادی کی کتاب ''قاموس'' ہے اور اس سے بڑھ کر ''لسان العرب''۔ ''صحاح جوہری'' میں الفاظ عربی کے چالیس ہزار مادے تھے۔ لسان العرب کے مولف نے چالیس ہزار مادے بڑھا کر اسی ہزار کر دیے۔ آج کل فرانس کے پروفیسر ''دوزی'' (۱) نے پچاس برس کی سخت محنت میں ایک ایسی کامل کتاب عربی فن لغت میں لکھی جس میں مذکورۂ بالا کتب لغت کے اوپر صدہا بلکہ ہزارہا الفاظ کا اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔

ہمارے فن ادب میں سب سے قیمتی ذخیرہ شعراے جاہلیت کا کلام ہے، لیکن اس میں سے ہمارے پاس بہت تھوڑا سا حصہ ہے۔ مثلاً سبعہ معلقہ، متنبی، حماسہ وغیرہ لیکن یورپ نے ''زہیر بن ابی سلمہ'' کے استاد ''اوس بن حجر'' اور ''لبید ابن ربیعہ'' اور بہت سے شعرا کا کلام معہ شرح اور حل لغات طبع کیا ہے اور صدہا کتابیں اس فن کے متعلق ایسی تلاش کر کے شائع کیں جو بالکل نایاب تھیں۔

جب ہمارے علما پر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ یورپین زبانوں میں ہر قسم کے علوم وفنون موجود ہیں اور خود ہمارے اسلامی علوم کے متعلق یورپ نے نہایت بیش بہا تحقیقات

کی ہیں تو یقیناً ہمارے علما یورپ کے علوم وفنون کو بھی اسی ذوق اور سرگرمی سے حاصل کریں گے جس طرح انہوں نے یونانی علوم وفنون کو حاصل کیا تھا۔

ندوہ کے مقاصد میں ایک ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے سرمایہ علمی سے فائدہ اٹھایا جائے اور یہ وہ چیز ہے جو اور مدارس عربیہ میں موجود نہیں اور نہ ہوسکتی، کیونکہ اس کے لئے جو سامان درکار ہے، وہ ہر مدرسہ مہیا نہیں کرسکتا، بلکہ اس کے لئے تمام قوم کی مجتمعہ قوت درکار ہے۔

اس موقع پر مجھ کو ایماناً یہ بھی ظاہر کردینا ضرور ہے کہ ندوہ کا اگرچہ بڑا مقصد یہی تھا، لیکن ابھی تک اس میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اب تک اس کا شائبہ بھی موجود نہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ تمام ملک میں جو علما درس وتدریس میں مشغول ہیں، ان کو اب تک یورپ کی نسبت وہی بداعتقادی ہے اور اس وجہ سے ندوہ کو باوجود سخت کوشش کے ایک بھی روشن خیال مدرس ہاتھ نہیں آتا۔ اب میں جدید گروہ کی طرف خطاب کرکے ندوہ کی ضرورت ثابت کرتا ہوں۔

جدید گروہ نے یہ غلط خیال کیا ہے کہ ندوہ مسلمانوں کو پھر قدیم تعلیم کے گڑھے میں ڈھکیلنا چاہتا ہے۔ ندوہ کا اصلی مقصد یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی تعلیم کے ڈانڈے ملا دیے جائیں۔ یہ قطعی ہے کہ جدید تعلیم اسلامی علوم اور اسلامی اثر سے بالکل خالی ہے، اس لئے اگر محض جدید تعلیم پر قناعت کی جائے تو مسلمانوں میں قومیت اور مذہب کی روح قائم نہیں رہ سکتی۔ نہ صرف اسی قدر بلکہ جدید تعلیم بجائے خود بھی نوکری اور غلامی کے سوا اور کسی کام کی نہیں۔ انگلش حکمرانوں نے سیکڑوں بار علیٰ رؤس الاشہاد کہا کہ علم کو علم کے لئے سیکھو، لیکن اس ہدایت اور نصیحت کا کیا اثر ہوا؟ کیا ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک شخص نے بھی علم کو علم کی غرض سے پڑھا، یا اب پڑھ رہا ہے؟ جدید تعلیم کا جو اسلوب ہے وہ ثابت کررہا ہے کہ یہ حالت ماضی اور حال پر محدود نہیں بلکہ آئندہ بھی اس فرقے سے کبھی یہ امید

نہیں کی جاسکتی کہ علم کو علم کی غرض سے پڑھیں گے۔

اے حضرات!

(انگریزی خوانوں کی طرف مخاطب ہوکر) یہ خدمت اور یہ فرض جس کی ہدایت بڑے بڑے وایسرایان ہند (۲) نے کی ہے، اس کو وہی غریب اور مسکین گروہ ادا کرے گا جس کو آپ پرانی تعلیم والا کہہ کر یاد کرتے ہیں۔اسی غریب گروہ نے ہمیشہ علم کو علم کی غرض سے پڑھا ہے اور یہی اب بھی اس خدمت کو انجام دے گا۔ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ عربی علوم وفنون آج کل محض بیکار ہیں اور ان سے دنیاوی معاش کی ضرورت میں کچھ مدد نہیں ملتی، تاہم آج بھی سیکڑوں ہزاروں طلبہ انہیں علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں، کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ علم کو علم کی غرض سے سیکھتے ہیں، نہ زر و مال اور جاہ وجلال کے لئے۔ شاید کسی کو خیال ہو کہ یہ مذہبی جوش کا اثر ہے اور صرف مذہبی خیال سے یہ علوم حاصل کیے جاتے ہیں۔لیکن ان لوگوں کی نسبت کیا کہیئے گا جو منطق، فلسفہ، ریاضی اور ادب کی تحصیل میں نہایت سرگرمی سے مشغول ہیں اور جنہوں نے صرف انہیں علوم میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں۔ان علوم میں کون علم مذہب سے تعلق رکھتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ نہیں بلکہ ایک کاروباری گروہ ہے اور اسی وجہ سے وہ علم کو صرف اس غرض سے پڑھتا ہے کہ کاروبار میں کام آئے، اس لئے ان کو علم کی تحصیل سے اصل میں کچھ غرض نہیں۔علمی گروہ وہی غریب علما ہیں جو فاقے کر کے علوم کی تحصیل کرتے ہیں، صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اس فرقے کو علوم جدیدہ کی فضیلت اور اس کی ضرورت ذہن نشین کرادی جائے پھر یہی گروہ ان علوم جدیدہ کو بھی اسی ذوق شوق اور سرگرمی سے سیکھے گا، جس طرح وہ آج علوم قدیمہ کو حیرت انگیز کوششوں سے حاصل کر رہا ہے اور یہی ندوہ کی تمام تر غرض اور تمام تر غایت ہے۔(۳)

تعلیقات وحواشی:

(۱) پروفیسر دوزی (prof. Dozy.1820-1883) عربی زبان وادب ،تاریخ اور تہذیب وثقافت کے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ہسٹری آف المحادان کی مشہور علمی کاوش ہے۔ جو کتاب المجیب فی تلخیص اخبار اہل المغرب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب عبدالواحد المراکشی کی تصنیف ہے۔ کئی جلدوں میں ان کی کتاب ڈچ زبان میں شائع ہوئی ہے۔

(۲) وایسرائے ہند لارڈ کرزن [۱۸۵۹-۱۹۲۵ء] ۶ رجنوری ۱۸۹۹ء سے ۱۸ رنومبر ۱۹۰۵ء تک وائسرائے کے عہدہ پر فائز رہا۔ تقسیم بنگالہ اسی کا شاخسانہ تھا، جس نے تمام مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا تھا۔

(۳) روداددارالعلوم ندوہ۔۱۹۰۲ء۔ص۱۰۲-۱۰۸

ooo

[۹]

ختم نبوت

سوا آٹھ بجے کے قریب مولانا شبلی اپنی جگہ سے اٹھے اور ''ختم نبوت'' پر موعودہ تقریر کرنے کے لئے، جس کے اشتیاق میں گویا جمیع حاضرین جلسہ ہمہ تن انتظار بیٹھے تھے، اسٹیج پر تشریف لائے۔

اول آپ نے بطور تمہید تبدیل نظام دیروزہ کا ذکر کیا۔ پھر کچھ ''عرض حال'' عذرِ علالت وغیرہ۔ بعد اس کے فرمایا کہ ختم نبوت ایک ایسا وسیع مضمون ہے جس سے کماحقہٗ بحث کرنے کو بڑی مہلت چاہئے۔ بحالیکہ یہاں اپنی حالت اور ضیق وقت طوالت کو مانع ہے۔ تاہم بخیال ایفائے وعدہ نہایت ہی مختصر طور پر کچھ عرض کرتا ہوں۔ باوجودیکہ مولانا بوجہ ناسازی طبع واقعی عذر علالت میں حق بجانب تھے اور بار بار فرماتے بھی جاتے تھے کہ ایسی حالت میں اس اہم مضمون کا جیسا چاہئے حق ادا نہیں ہوسکتا، پھر بھی ان کی فاضلانہ ومحققانہ جادو بھری تقریر میں وہ اثر تھا کہ باید وشاید سامعین بالکل خاموش ہمہ تن گوش بنے مولانا کی طرف ٹکٹکی باندھے سن رہے تھے، لیکن اس خاموشی کے عالم میں بھی بار ہا مولانا کا حسن بیان اس بات پر مجبور کر دیتا تھا کہ ہر سکوت کو توڑ کر سبحان اللہ، مرحبا، جزاک اللہ کہہ کر فاضل مقرر کو داد دیے بغیر نہ رہیں۔ وکیل کے رپیریزینٹیٹو کی عجیب کیفیت تھی۔ مولانا کی دلآویز اسپیچ کا تقاضا یہ کہ کاغذ قلم چھوڑ کر نقش حیرت بنے۔ مولانا کی صورت کو تکے جایئے اور ان کی آواز

کو جولوگوں پر عامل مسمریزم کا سا اثر ڈال رہی تھی یک سو ہو کر سنے جائیے۔ ادھر مقتضائے منصبی یہ کہ ساری تقریر بالفاظہ نہ ہو سکی تو کم از کم خلاصۂ مطلب کے طور پر کچھ نوٹ ہی کر لئے جائیں۔ ناظرین قیاس فرما سکتے ہیں کہ یہ کیسی دقت کا سامنا تھا۔ یا تو تقریر کا لطف ہاتھ سے جائے یا شمولیت جلسہ کی غرض و غایت۔ ایسی حالت میں مولانا کی تقریر کا جو کچھ بھی لب لباب ہدیۂ ناظرین ہو سکے غنیمت سمجھنا چاہئے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جن احباب نے وہ تقریر خود اپنے کانوں سنی ہے، انہیں اس پریشان اور غیر مسلسل بیان میں کچھ مزا نہ آئے گا، مگر خیر جو حضرات اس وقت کسی وجہ سے جلسہ میں تشریف نہ رکھتے تھے انہیں ذرا دور لطف آ ہی جائے گا۔

فرمایا کہ ''ندوہ کی ضرورت میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور اگر چہ اس کی ضرورت ثابت کرنے کا یہ وقت نہیں ہے تاہم اس کی اہمیت ہمیں ہر وقت یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کی حقیقت و ماہیت، اس کے قیام کی اشد ضرورت اور یہ کہ اس کی ضروریات کیا کیا ہیں اور مسلمانوں کی کیسی کیسی امیدیں اس سے وابستہ ہیں؟ یہ باتیں قوم کے اچھی طرح ذہن نشین ہونی چاہیں۔ تب اس کے وجود سے قوم کو مطلوبہ فوائد اور اہم نتائج حاصل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کی اصلیت اور وقعت ہی انسان کے دل میں نہیں جمتی تب تک نہ وہ اس کی جانب پوری توجہ کر سکتا ہے نہ اس سے کماحقہٗ مستفید ہونے کی کوشش۔ اسی وجہ سے بہت سی اہم تجاویز اور عظیم الشان کاموں کے متعلق بعض افراد قوم کی امیدیں موہوم ثابت ہوتی ہیں اور جن کا وجود غیر ضروری و بے سود۔

فرمایا کہ قیام ندوہ کے وقت مسلمانوں کے دو گروہ تھے۔ علمائے کرام کے حالات و خیالات اس کے بارہ میں کچھ اور تھے۔ جدید الخیال لوگوں کے کچھ اور۔ اور دونوں کی رایوں میں اختلافِ عظیم۔ مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سارے ہی بڑے کاموں میں ابتداً ایسا ہوا کرتا ہے، لیکن ان اختلافات اور ابتدائی مشکلات کی وجہ سے اولوالعزم گھبرا نہیں جایا

کرتے۔اوراسلام میں تو ایسے اختلافات کورحمت بتایا گیا ہے۔اس کی تو تعلیم ہی یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں سے روشن خیالی، تحمل، حوصلہ اور استقلال کو کام میں لاکر فائدہ اٹھایا جائے۔اسی پاک اور قابلِ تقلید طرزعمل کی بدولت سلف صالحین کے مبارک زمانوں میں قوم کو بڑے بڑے عظیم الشان فوائد حاصل ہوتے رہے۔اسی شیوۂ محمود کے طفیل ابتدائے اسلام اور اس کی چند شروع کی صدیوں میں مسلمانوں سے وہ وہ کام بن پڑے جن کی نظیر زمانہ بعد کے صدہا سالوں میں بھی نہ لا سکا اور نہ لا سکے گا۔اس موقع پر مولانا نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے سبق آموز عجیب وغریب حالات، جمع قرآن کی کیفیت، زمانہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں جمع احادیث کی ضرورت، علوم تفسیر وفقہ وغیرہ کی تدوین، علوم یونان اور روم وشام وغیرہ کے عربی تراجم، ادب عرب کا ابتدائی زمانہ، پھر اس میں اقوام غیر کے علوم کا اضافہ اور بالآخر لسان العرب کے انواع، علوم فنون کے خزائن سے مالا مال ہونا وغیرہ وغیرہ بیان فرما کے کہا کہ سلف نے تو اپنے زمانہ میں ضرورت وقت کو اچھی طرح سمجھا اور اس کو پورا کرنے کا حق ادا کر گئے لیکن زمانہ دن بدن ترقی پر ہے۔ اس کی ضروریات بھی ہمیشہ بڑھتی جاتی ہیں اور حالت موجودہ ہم سے بزور یہ کہلواتی ہے کہ اب بھی اسی طرح ہمیں اصلاح وترقی علوم وفنون کی ازبس احتیاج ہے۔پس سلف کی طرح ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ غیر اقوام کے علوم وفنون سیکھیں۔

اس موقعہ پر آپ نے ایک نہایت اہم نتیجہ پر زور دیا۔ وہ یہ کہ میرے پچھلے بیان کا بہت ہی ضروری ماحصل یہ ہے کہ اس مبارک زمانہ کے علمائے اسلام نے دوسری قوموں کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں لینے سے ہرگز تعصب نہیں کیا۔اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال فاسد ہو تو تاریخ شاہد ہے، جو بڑی زبردست نظیروں سے اس کی تردید کرتی ہے۔مسلمان اگر تعصب برتتے تو یونانی فلسفہ اور سائنس کی تحصیل میں شاقہ محنتیں کیوں اٹھاتے؟ مگر انہوں نے ان علوم کو بشوق ورغبت سیکھا اور ایسا سیکھا جیسا سیکھنے کا حق ہوتا ہے۔مسلمانوں

کے علم کلام کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے غیر اقوام کے علوم سے فائدہ اٹھانے میں کس فراخ دلی اور بے تعصبی سے کام لیا ہے اور کیوں نہ لیتے؟ ان کے نزدیک تو علم مومن کی کھوئی ہوئی دولت تھی کہ جہاں پائے اٹھالینی چاہئے۔ وہ اسلام کو خدانخواستہ کسی پہلو سے کمزور اور بودا بھی نہ جانتے تھے جو اس ڈر کے مارے ان علوم سے اجتناب کرتے کہ کہیں یہ (علوم) اسلام کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچائیں یا ان کے مقابلہ میں اسلام کے اصول وعقائد کی بنیادیں متزلزل نہ ہو جائیں۔ معاذ اللہ۔ جیسے زمانۂ حال کے بعض علما کا یہ خیال ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔ یہ مانا کہ تنہا عقل کی روشنی کافی نہیں ہوسکتی مگر نعوذ باللہ ایسا بھی تو نہ ہو کہ اسلام کو خلاف عقل (غیر معقول) سمجھا جائے بحالیکہ عقل ہی کی وجہ سے انسان اس سارے بار کا مکلّف ہے۔ سلف صالحین کے بھی اگر یہی خیالات ہوتے اپنے دعاوی عقائد کو دلائل عقلیہ سے کیوں ثابت کرتے؟ معقولات سے اسی طرح نہ بچتے تو جس طرح اسلام کے نادان دوست دور بھاگتے ہیں۔ شرح موافق کو دیکھو اس کا دو تہائی سے زیادہ حصہ علوم یونان سے ماخوذ ہے۔ پھر یہ کہ جن علوم کو ہم نے غیر قوموں سے لیا ان کو اپنا سمجھ کر ان کی حفاظت وحمایت کی۔ چنان چہ اس کا ثبوت اب تک یہ حال ہے کہ اگر کوئی طب یونانی کو برا کہے تو ہمیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ ہماری اپنی چیز ہے۔ یہی تو باتیں تھیں جن کی وجہ سے مدت قلیل کے اندر اندر مسلمانوں کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بج گیا اور ان کے بین کارناموں کا اک زمانہ اب تک اعتراف کرتا ہے۔

مگر ناظرین میری تقریر سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ علمائے اسلام میں علوم کی وہ پیاس نہیں ہے جو اس زمانہ میں تھی یا یہ کہ علما ان علوم جدیدہ سے کچھ بیر یا تعصب رکھتے ہیں۔ نہیں نہیں بلکہ حقیقت میں بات اور ہی ہے۔ وہ یہ کہ علم وفن جسے کہتے ہیں یورپ میں اس کا نام نہیں۔ آج اگر اس غلط فہمی یا لاعلمی کا پردہ ہٹ جائے تو اسی شوق وسرگرمی سے علوم مغربیہ کی تحصیل پر متوجہ ہو جائیں جیسے اسلاف ہوئے تھے۔ پس اب ضرورت کاہے کی ہے؟ یہی کہ

علما کو کسی طرح آ گاہی ہو۔انہیں پتہ لگے کہ یورپ اس وقت علمی خزانوں سے مالا مال ہے۔ مسلمان ہند اس امر سے بے خبر ہوں تو ہوں اب تو بعض مما لک اسلامیہ میں بھی السنہ یورپ کی کتب کا ترجمہ ہورہا ہے مثلاً بلاد شام ومصر و بیروت وغیرہ۔ دیگر علوم کو جانے دو، وہ خود آپ کی عربی کا علم جس قدر وہاں ہے ہم میں نہیں۔ مجدالدین فیروزآبادی کی قاموس لغت کی سب سے اخیر کتاب ہے۔ سب سے اول کتاب میں چالیس ہزار مادے تھے، پھر ساٹھ ہزار ہوئے، اب لسان العرب میں اسی ہزار مادے ہیں اور اس پر بھی ہزار ہا ایسے الفاظ کا اضافہ ہوگیا اور ہوتا جاتا ہے کہ جن کا ہماری کتب لغت میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ پس زبان عربی اور علوم اسلامی کی روز افزوں ضروریات پر متوجہ ہونے کی کیسی سخت احتیاج ہے۔ مگر افسوس ہم سے تو کچھ ہو نہیں سکتا ہاں غیر اقوام البتہ اس نعمت اور سعادت سے خوب حصہ لے رہی ہیں۔ نہ صرف اپنا بلکہ ہمارے حصہ کا بھی۔ یورپ کی علمی سوسائٹیوں نے عرب جاہلیت کے اشعار کو کس کس تلاش وجستجو سے بہم پہونچایا ہے۔ جرمنی میں کتب عربیہ کے انطباع اور ترجمہ وغیرہ میں کیسا کچھ اہتمام کیا گیا ہے۔ پڑھ پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے اور اپنی قومی پستی اور کم حوصلگی پر رونا آتا ہے۔

پس اے مسلمانو!

ابونصر فارابی اور بوعلی سینا وغیرہما نے جس طرح فلسفہ یونان کے مقابلے پر اسلامی علم کلام کا ایجاد کیا تھا۔ اسلام کی حمایت وحفاظت اور اہلِ اسلام کی اصلاح وترقی کے لئے اب بھی ویسا ہی ہونا ممکن ہے بشرطیکہ پہلے علوم یورپ سے آ گاہی حاصل کریں۔

یہی اہم مقاصد ندوہ کی غرض وغایت ہیں۔ انہی سے بخوبی واقف ہونے پر بعض لوگوں کا یہ اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے دیگر موجودہ انسٹی ٹیوشنوں سے بڑھ کر اردو کا وہ کون سا انوکھا مقصد ہے؟ ہمیں اس بات کا اعتراف اور افسوس ہے کہ ان مقاصد میں ندوہ کو اب تک کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی مگر اس میں ندوہ کی کچھ خطا نہیں۔ یہ ہمارا اپنا

قصورِ ہمت ہے یا عدمِ فرصت اور یہ بدظنی کہ یورپ علوم سے تہی دست ہے۔ان موانع کے ہوتے اس قلیل مدت میں کوئی بہت ہی زبردست کارنامہ نہ دکھلا سکنے پر ندوہ معذور سمجھا جانا چاہیئے۔ ہماری قوم میں اس وقت دو گروہ ہیں، کاروباری اور علمی۔ دونوں کے مشاغل مختلف ہیں۔قومی ترقی کا اصل اصول تو یہ ہے کہ اس کے افراد میں کاروباری اشغال سے واسطہ رکھنے والے ہوں تو ساتھ ہی ساتھ علوم وفنون کو ترقی دینے والے بھی ہوں۔ برخلاف اس کے ہمارے نوجوانوں میں مادی ترقی کا شوق ہے تو دین اور علوم وفنون کی طرف سے بے اعتنائی۔ یہ خرابی نہ ہوتی تو ندوہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ چاہیے کہ علم اپنی غرض وغایت آپ ہی سمجھا جائے۔ندوہ کو ایسے ہی طالبان علم کی ضرورت ہے اور اسی قسم کے خادمانِ علوم وفنون وہ پیدا کیا چاہتا ہے۔

اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے کہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر واپس تشریف لے گئے۔مولانا کی تقریر کا مندرجہ بالا حصہ حقیقت میں بطور تمہید تھا اور اصل مضمون پر جو کچھ آپ نے فرمایا تھا، وہ آگے آتا ہے۔

اول آپ نے ما کان محمد ابا............کی تفسیر فرمائی۔ پھر اس اہم ترین مسئلہ میں اپنی ہیچ مدانی کا اقرار، پھر شاہ عبدالعزیزؒ پر سلسلہ محدثین کا ختم ہونا۔ یہاں آپ نے شعر

اے فخرِ رسل قرب تو معلوم شد
دیر آمدۂ راہ دور آمدۂ

سے علوشانِ محمدی (علیہ الصلوٰۃ السلام) کی توضیح فرمائی۔ بعدازاں فرمایا کہ ہر کمال کے بعد زوال ہوتا ہے۔تمام کمالات کی ترقی کی ایک خاص حد پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ چناں چہ قمر کی مثال سے بخوبی واضح ہے کہ اس حدِ خاص سے آگے جو بدر کی حالت میں ہوتی ہے، مزید کمال ظہور میں نہیں آ سکتا۔اسی کے ضمن میں آپ نے خطِ مستقیم کی مثال دے کر بتایا کہ جس طرح دو نقاط کے مابین قریب ترین فاصلہ خطِ مستقیم ہی ہوتا ہے ایسے ہی انسان کے

لئے جو راہ ہدایت اسلام نے بتائی وہی صراط مستقیم ہے۔ گویا الیوم اکملت لکم دینکم فرما کر خود اللہ تعالیٰ نے یہ امر بوضاحت بتلا دیا کہ بعثت انبیاء کی جو غرض و غایت تھی وہ آج ہم نے پوری کردی۔ اب اس (دین اسلام) سے زیادہ کامل و مکمل اور کوئی دین ہو نہیں سکتا۔ فرمایا یہ لطیفہ میرا اپنا اختراع نہیں بلکہ شریعت محمدیہ (علی صاحبها الصلوة والسلام) کا ہر پہلو سے حد اعتدالی پر واقع ہونا اس واقع نفس الامر کا بین ثبوت ہے۔ فرمایا اسی لئے قرآن شریف کے شروع ہی میں بندوں کو صراط مستقیم مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ کیوں کہ یہی منتہائے ہدایت ہے اور یہی مقصود و مدعائے نبوت۔ چوں کہ سابقہ شریعتیں اس بارہ میں ناقص و غیر مکمل تھیں اور اسلام نے آ کر اس کمی کو پورا کیا، اس واسطے پیروان اسلام کو سب سے پہلے یہی دعا کی تعلیم فرمائی گئی۔

فرمایا مذہب کے اجزاء عظیم دو ہیں، معتقدات اور اعمال۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام کے ان دونوں اجزا میں ایسی کیا خصوصیت ہے جو اس کو دوسرے مذاہب پر فوقیت دیتی ہے۔ اولاً استقامت کو لو۔ کسی اور مذہب نے اپنا عقیدہ عقل سے منوانے کا ادعا نہیں کیا۔ جس مذہب کی چھان بین کرو یہی پاؤ گے کہ وہ خود دلائل نہیں دیتا بلکہ اس کے حامی اس کی معقولیت ثابت کرنے اور حقیقت کے دلائل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو بڑی تحدی کے ساتھ اپنی معقولیت و حقیقت کا ادعا کرتا اور اس کے دلائل و براہین بھی پیش کرتا ہے۔ یہاں آپ نے ضمناً ایک نہایت اہم نکتہ فرمایا کہ ہمارے علم کلام میں لوگوں نے یہ بڑا بھاری نقص پیدا کر دیا ہے کہ دور از کار استدلال سے کام لیتے ہیں اور خود قرآن کریم نے جو بین دلائل دئے ہیں انہیں اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے آگے اور سب دلیلیں ہیچ ہیں۔ قرآن میں اسلام کے سارے ہی عقائد پر دلائل موجود ہیں۔ وہ کوئی بات تقلیداً نہیں منواتا۔ اسلام نے عقل کو بے کار و معطل نہیں بتایا مگر جملہ امور پر حصر بھی نہیں رکھا کیوں کہ عقل انسانی دراصل تمام متعلقات دین پر حاوی ہے ہی

نہیں بلکہ ایک خاص حد پر پہنچ کر اس کا عجز ثابت ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا کلام خواجہ کی فہم ممکن ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضرور نہیں کہ اس کی نظیر لانے پر بھی قدرت ہو۔ یہی حال اسلام کا ہے۔ فرمایا مذہب کا ایک جزو اعظم اک برترین قوت کا اعتراف ہے جو مقتضائے فطرت ہے۔ اور مثل دیگر جذبات فطرت کے کل بنی نوع انسان میں مشترک ہے۔ باستثنا ملاحدہ ہر بشر کو طوعاً و کرہاً اس ہستی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اس مقام پر مولانا نے نہایت خوش اسلوبی و حسن بیان سے توحید فی الذات، توحید فی الصفات، احوال مشرکین عرب کی توضیح کر کے فرمایا کہ توحید فی الذات پر ایمان لانا اور پھر شرکت فی الصفات کا بھی عقیدہ رکھنا توحید خالص کے منافی ہے۔ پھر توحید خالص قبل از اسلام اور اوتاروں کی اصل بیان فرما کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر کیا کہ کفار آپ پر تعجب کرتے تھے کہ یہی خدا کا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا، چلتا پھرتا ہے اور تمام لوازمات بشریت اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ دیگر انبیاء علی نبینا وعلیہم الصلوۃ والسلام میں سے کوئی کلیم اللہ کہلائے، کوئی روح اللہ مگر ہمارے رسول کریمؐ رسول اللہ کے معزز لقب سے ملقب ہوئے۔ پھر نماز میں پنج وقتہ ان کی رسالت کے ساتھ ہی عبودیت کا بھی اقرار تعلیم کیا گیا۔ اس میں بڑی حکمت یہ تھی کہ مبادا امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش اعتقاد لوگ کسی زمانہ میں جا کر اوتاروں والی قوم کی طرح شرک کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

دیگر طویل توضیحات سے بوجہ ضیق وقت قطع نظر کر کے اب آپ نے دوسرے اسٹپ یعنی عبادات کو لیا۔ اس کے ضمن میں معاملات یعنی حقوق العباد کی تشریح کی۔ پھر فرمایا کہ مفہوم عبادت میں بعض لوگ غلط فہمی کرتے ہیں۔ منشا احکام عبادت دراصل یہ ہے کہ بندوں کی تطہیر ہو۔ خداوند تعالیٰ ہماری بندگی کا کچھ محتاج نہیں نہ وہ ہمیں معرضِ امتحان اور ابتلا میں ڈالنا چاہتا ہے۔ راہبوں وغیرہ نے منشائے الٰہی کو ٹھیک نہ سمجھا کہ اپنے اوپر مجاہدات شاقہ لازم کر لئے۔ پھر فرمایا کہ اہلِ یورپ کے دلوں میں آج کل ایک عجیب خبط سمایا ہے۔

وہ جمیع مذاہب موجودہ سے بدظن ہوکر ایک جدید مذہب کی ضرورت سمجھتے ہیں اور اس کی ایجاد کے منصوبے کا ذکر سنتے ہیں۔ چناں چہ ایک فلاسفر تجویز کرتا ہے کہ مذہب میں ان تین صفات کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس میں محنت شاقہ نہ ہو۔ دوسرے وہ انسانی عقائد پر مبنی ہو۔ تیسرے خدا کی اس سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ اسلام کی عبادات میں یہ اور اسی قبیل کی تمام خوبیاں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یہاں آپ نے بطور ثبوت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ارکان اسلام کے مصالح اور فوائد ونتائج بیان فرما کر کہا کہ تعلیمات اسلام پر کاربند ہوکر معاملات ہی میں عبادت کی یہی غرض وغایت حاصل ہوسکتی ہے۔ چناں چہ اسلام تاجر صادق کو شہید قرار دیتا ہے۔ اسلام میں تین لڑکیوں والے باپ کے لئے اگر اس نے اپنے فرائض متعلقہ کماحقہٗ ادا کئے ہوں جنت کو لازم کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر تمام معاملات کا بھی اسلام میں یہی حال ہے۔ پھر حقوق العباد سے متعلق مورل فلاسفی کی بنا اور نیز یہ بیان کر کے انسان پر اس کی ذات کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ کہا کہ نفس کشی کے معاملہ میں اختیارات ذات کے متعلق قدما سے غلطی ہوئی کیوں کہ انسان کی ذات دراصل دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک اس کے اپنے متعلق دوسرے سوسائٹی سے متعلق۔ فرمایا عرب جاہلیت میں قتل اولاد کا جو دستور تھا وہی قدمائے ہنود کا بھی معمول تھا۔ فی الحقیقت انہی اختیارات کے بارہ میں اک بڑی بھاری اصولی غلطی تھی۔ اسلام نے اس غلطی کو ''لاتقتلو اولاد کم'' کا حکم دے کر کس خوبی سے مٹایا۔ پیدائش دختر کے وقت اس زمانہ میں جو افسوس ناک کیفیت ہوتی تھی مسلمانوں میں اس آیت شریفہ کے نزول سے اس کا سدِ باب ہوگیا۔............ سے بروز حشر یہ سوال کیا جائے گا اسے اسلام نے کیسے لطیف اور نتیجہ خیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ رومن لا بعض پہلوؤں سے نہایت اہم ہے۔ حتیٰ کہ اس سے اب تک استفادہ کیا جاتا ہے پھر بھی وہ نقصوں سے خالی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، آرائیں آئین، مگر برخلاف ان سب کے اسلام کی تعلیم ہر طرح سے احسن اور عدیم النظیر ہے۔ اسلام نے باوجود یکہ وہ

عرب میں پیدا ہوا لیکن عجم، تاتار و ہند وغیرہ کو غلام سے آقا اور رعیت سے بادشاہ بنا دیا۔ یہ کس بات کا نتیجہ تھا؟ اسلام کی ان خوبیوں ہی کا جو اس میں اور دیگر مذاہب میں مابہ الامتیاز ہیں۔ غلامان اسلام کی قابل فخر حالت دیکھنا ہو تو محمود وغیرہ شاہان قدیم کی حیرت انگیز شان و شوکت کو دیکھئے۔ دراصل عظمت و شوکت کی روح پھونک دینا خاصۂ اسلام ہے اگر کوئی اس کے اصول پر پورا پورا کاربند ہو۔ پھر ذمی، معاہد، عربی کی تشریح کی اور ذمیوں کے حقوق بیان فرما کر کہا کہ اسلام نے ہر ایک قسم کے لوگوں سے احسن سلوک برتا۔ پھر وصایائے حضرت فاروق، آپ کے عہد میں رعایا کے حقوق، وصولی جزیہ کی کیفیت، ایک یہودی کا ذکر کہ وہ دریوزہ گری سے جزیہ کی ادائیگی کا تردد کرتا پھرتا تھا، اس پر آپ کی رحم دلی، عدل و داد میں اسلام اور خلفائے راشدین کا بے نظیر شیوہ، متناقض آیات پر خود قرآن کریم کا قولِ فیصل، قتل و اخراج وغیرہ کے متعلق ارشاد ربانی کی حکمت اور انجیل کی ناقص تعلیم، اس پر عمل کا نہ ہونا، چناں چہ مسیحی اقوام کی حالت کا اس پر شاہد ہونا وغیرہ وغیرہ صدہا قیمتی نکات و معلومات بیان فرما کر آپ نے دس بجے اپنا لکچر ختم فرما دیا۔

(صحیفہ لاہور۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ ص ۸۶-۹۱)

○○○

[۱۰]

تعلیم وتربیت

صاحب صدر و دیگر حضرات انجمن!

آپ لوگوں میں سے شائد بعض صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ جیسے ہندوستان میں بعض مصلح یا ریفارمر پیدا ہوئے ہیں، اسی طرح مصر میں بھی ایک نامور مصلح پیدا ہوا جس کا نام (اس وقت یاد نہیں) پرانی طبیعت کے عالم تھے، جبہ وعمامہ پہنتے تھے اور پاؤں میں چپل پہنا کرتے تھے۔ لیکن باوجود اس تقدس اور سادگی کے ایک دفعہ ضرور فرانس یا جرمنی کا سفر کیا کرتے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ یورپ کیوں جاتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ یہاں رہ کر بوسیدہ ہوجاتا ہوں اور وہاں جا کر پھر تازہ ہوجاتا ہوں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا میں افسردگی چھا جاتی ہے اور یورپ میں تازگی اور جوش پیدا ہوجاتا ہے۔

حضرات!

جب سے میں نے اپنے تعلقاتِ ملازمت چھوڑے ہیں اور ندوہ کی خدمت کو مقصد زندگی قرار دیا ہے۔ مجھے بھی تازگی اور جوش کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میں یورپ تو نہیں جاتا۔ پنجاب میں سفر کرتا ہوں تا کہ اپنی افسردگی کو تازگی اور جوش سے بدل سکوں۔

ہمارے ملک میں جو سستی اور کاہلی پائی جاتی ہے، وہ یہاں (پنجاب میں) نہیں

ہے۔آپ کا ملک ہمہ تن جنبش اور حرکت میں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اس کا صحیح استعمال کیوں نہیں کرتے۔ اگر صحیح استعمال کرتے تو آپ ضرور بڑھ جاتے، لیکن وہ اسٹیم اور بھاپ بے کار رہا جاتا ہے۔ میں نے بمبئی کے میمنوں کو دیکھا ہے۔ کلکتے کے معززین کو دیکھا ہے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں بڑا کام کیا ہے، ان کا درجہ اور اقتدار اس کام کے کرنے کے لئے سخت بڑا معاون و مددگار رہا ہے۔ بمبئی میں ہائی اسکول ہے جو بدرالدین طیب جی (۱) کا قائم کردہ ہے، اور ان کی ذاتی وجاہت سے یہ کام چل رہا ہے۔ کلکتے میں کوئی مثال موجود نہیں۔ کراچی میں اسلامیہ ہائی اسکول ہے۔ پنجاب میں اسلامیہ کالج ہے، جس کی عمارت کچھ سامنے ہے۔ کچھ بننے والی ہے۔ یہ کن لوگوں نے قائم کیا؟ کیا کسی خطاب یافتہ نے قائم کیا؟ یا لکھ پتی یا کروڑ پتی نے بنایا؟ ہرگز نہیں۔ باوجود اس کے کہ اس کے قائم کرنے والے نہ تو لکھ پتی اور نہ کروڑ پتی ہیں اور نہ ہی خطاب یافتہ۔ پھر بھی اس کو شروع کر کے یہاں تک پہنچا دیا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جوش زیادہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ حدیث پڑھتے ہیں، یعنی ہمارے علما، کیا وجہ ہے کہ ان میں وہ اخلاق اور عمدہ صفات پیدا نہیں ہوتیں جو اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین میں پائی جاتی تھیں۔ مانا کہ ویسے نہیں ہو سکتے، لیکن کچھ تو ہونا چاہئے۔ خیال کر لیا جاتا ہے کہ ان کی طاقتیں فوق البشر تھیں۔ چڑیا اڑتی ہے، تم کیوں نہیں اڑتے، اس لئے کہ اڑا نہیں جاتا۔ میں بدرالدین یا حسن علی (۲) نہیں ہوں، ایسا کام نہیں کر سکتا۔ یہ ضرور نہیں کہ بڑے بڑے لوگ ہی بڑے کام کریں۔ خیال کیا جاوے تو ہر ایک آدمی بڑا کام کر سکتا ہے۔

اس کالج یا انجمن کا نام اس پر منحصر ہے کہ آپ جلسہ کرتے ہیں۔ چندہ ہوتا ہے، جو اس کے بقا کا باعث ہے، مگر یہ کوئی مستقل اور پائدار طریقہ نہیں ہے۔ اگر چہ جب تک اور صحیح طریقہ نہ نکلے، اسی پر چلنا چاہئے۔ آپ کو چاہیے کہ ایک دفعہ کوشش کر کے پندرہ بیس لاکھ روپیہ جمع کریں تا کہ روزانہ کی گداگری سے نجات ہو۔ یہ تو آپ کا مسلک ہے کہ اس طرح

کام چل جاتا ہے۔ بلحاظ آپ کی انجمن کے مدرسے کی مقامی حالت کے کہ جو کچھ میں کہتا یا تعلیم انگریزی کے متعلق ہوتا یا آپ کے مدرسے سے ہی اس کا تعلق ہوتا، لیکن میں پاتا ہوں کہ مسلمانوں میں دو گروہ ہوگئے ہیں۔ ایک علماء اور اس کے پیروؤں کا گروہ۔ دوسرا انگریزی خوانوں اور ان کے ہم خیالوں کا گروہ۔ ایک گروہ میں دوسرے گروہ کے لوگ کم شریک ہوتے ہیں۔ میں نے اس بنا پر مناسب سمجھا ہے کہ جہاں علما کا مجمع ہو، انگریزی خواں آئیں اور ان کو مولوی صاحب اپنا وعظ سنائیں۔ انگریزی خوانوں کے سامنے ہمارے جیسے مولوی کیوں کرلاویں اور ان سے کچھ سنیں، اسلام کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کے سننے کا انگریزی خوانوں کو کم موقع ملتا ہے۔

آپ اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم دنیا میں تشریف لائے، ایک مذہب اور کتاب پیش کی۔ اس کی نسبت دلیری سے کہا کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہے، یہ اس کا وحی اور الہام ہے۔ خدا کے منہ سے جو دعویٰ ہوا:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا. (مائدہ۔ ۳)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''آج کے دن میں نے پورا کر دیا دین اور مذہب کو اور تم پر اپنی نعمت کو کامل کر دیا اور اسلام کے مذہب کو تمہارے لئے پسند اور گوارا کرلیا۔'' غور کرنے کی یہ بات ہے کہ مذہب اسلام کامل ہوگیا۔ اب مذہب میں ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ دوسری آیت میں پھر ارشاد فرمایا:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ و خاتم النبیین. (احزاب ۴۰)

رسول اللہ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ پیغمبر خاتم الانبیاء ہیں۔ ان کے بعد اور کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کے وجہ یہ ہے کہ

''انسان کی ترقی کے واسطے اللہ تعالیٰ کے علم میں ایک حد مقرر تھی۔ جوں جوں وہ حد ترقی کے قریب ہوتا گیا تو شریعت، مذہب، قانون، اخلاق بھی ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ جناب محمد رسول اللہ صلعم کے زمانے میں قانون، اخلاق، شریعت مکمل ہوگئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اب کسی اور نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں اور اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔''

تعجب ہے کہ خداوند تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی نعمت آج تم پر کامل کر دی اور نبوت ختم ہو چکی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اور کوئی نبی نہیں آنے کا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام قسم کے اخلاق حسنہ اور مذہبی اعمال غرض کہ حق اللہ اور حق العباد کو کامل اور اتم تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان علی العموم ایسی بے پروائی کے ساتھ منہ موڑ کر انگریزی اخلاق اور انگریزی تمدن اور انگریزی وضع کی تقلید کرنا ہی اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ ہر وقت اور ہر آدمی انگریزی تہذیب کو اپنا مقتدا اور امام بناتے ہیں۔ یہاں تک جب کوئی امر ہو تو تمام صفات حسنہ کا مخزن اسی کو سمجھتے ہیں۔ ہر ایک بات میں مشاہیر یورپ ہی کو بطور نمونہ اور مثال پیش کرتے ہیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ہر قسم اور ہر فن کے ایسے لائق اور بزرگوار گذرے ہیں کہ جو اس دنیا میں آسمانِ شہرت کے سورج بن کر چمکے ہیں۔ ہمیں اپنی تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اس اسلامی خزانے میں کس قدر بے بہا جواہر اور درخشندہ مثالیں موجود ہیں جن کے مقابل مشاہیر یورپ بالکل ہیچ ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ انگریزی خواں مسلمان تاریخ کے پڑھنے اور سمجھنے کی تکلیف گوارا فرماویں اور یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ ہمارے نوجوان اپنی مذہبی کتابوں کی طرف خصوصاً کتاب اللہ اور حدیث شریف کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے۔ اگر وہ اسکول کے وقت کا آٹھواں حصہ اس کام کے واسطے بھی مقرر کر دیں تو ان کو

اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کی پوری یہ بات بھی بخوبی معلوم ہو جاوے کہ مستند اہل فن، اہل علم کس قوم میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ عالم، صناع، بہادر، اولوالعزم، قوم کی قومیت کو قائم رکھنے والے اور سیاح کس قوم میں پائے جاتے ہیں۔''

''اس جوش کے قائم رکھنے کا ذمہ اس شخص یا اشخاص کے ہاتھ میں ہے جن کے ہاتھ میں عنانِ انتظام کالج ہے۔ درحقیقت لازم تو یہ ہے کہ طلبا کی تعلیم و تربیت کے لئے ایسے استاذ رکھے جاویں جو نہ صرف حدیث پر چلنے کی ہدایت کریں بلکہ مذہب پر چل کر مثال اور نمونہ بنیں تاکہ اس کالج کے طالب علم نہ صرف تعلیم یافتہ مسلمان ہوں بلکہ سچے اور واقعی مولوی بھی بنیں اور یہ طریق عمل تمام اسلامی درس گاہوں کے لئے قابل تقلید نمونہ بنے تاکہ آئندہ نسلیں دنیاوی ترقی کے ساتھ دینی ترقی بھی کرتی جاویں۔''

تعلیقات وحواشی

(۱) جسٹس بدرالدین طیب جی [۱۸۴۴-۱۹۳۹ء] جج بمبئی ہائی کورٹ، بمبئی کی بہت مشہور، تعلیم یافتہ، مہذب اور بڑی با اثر اور فعال شخص تھے۔ عربی و فارسی تعلیم کے بعد الفنسٹن کالج میں داخل ہوئے۔ بعد ازاں لندن چلے گئے اور لندن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور بیرسٹر ہو کر واپس آئے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے تعلیم کے لئے انگلستان کا سفر کیا اور بیرسٹری پاس کی۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو بیرسٹری پاس کر کے بمبئی ہائی کورٹ کے جج منتخب ہوئے۔ وہ کانگریس کے ابتدائی ارکان میں سے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں جب اس کا پہلا اجلاس ہوا تو وہ اس میں شریک تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جو کانگریس کے تیسرے صدر منتخب ہوئے۔ بمبئی کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے انہوں نے اسکول قائم کیا۔ انجمن اسلام کے بھی وہ بانیوں میں ہیں۔ ۱۹۰۳ء کے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بمبئی کی بھی انہوں نے صدارت کی۔ اور خطبہ دیا۔

(۲) حسن علی آفندی [م: ۱۹۰۳ء] یہ بھی بدرالدین طیب جی کے خانوادے ہی کے ایک فرد

اور قسطنطنیہ میں ہندوستان کے ایک بڑے تاجر تھے۔عطیہ فیضی اور زہرا فیضی انہی کی بیٹیاں تھیں۔ جو جدید تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وادب کی بھی دلدادہ اور عمدہ مذاق رکھتی تھیں۔مضمون نگاری بھی کیا کرتی تھیں۔اس خانوادے نے بھی تعلیم سے خاصی دلچسپی لی۔حسن علی آفندی کی اہلیہ امیر النساء امیرؔا جو شاعرہ تھیں بچیوں کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ان کا مجموعہ کلام بھی شائع ہوا ہے۔

ooo

[۱۱]

تصوف

موضوع بحث آج یہ ہے کہ تصوف کیا چیز ہے اور اسلام سے اس کا تعلق کیا ہے۔؟ شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیزیں ہیں یا ایک ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کا تصوف قرن اول اور قرن ثانی کے بعد پیدا ہوا ہے، اس لئے اس کو اسلام سے علاحدہ سمجھنا چاہئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصوف شریعت کا حصہ اور شاخ ہے۔ صرف نام کے باعث جداگانہ چیز سمجھی جاتی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اجمالی اور مجموعی تھی۔ بعد میں شاخیں اس تعلیم کی علاحدہ علاحدہ ہوگئیں۔ اور وہ جدا جدا علم ہو گئے۔ محدث جامع الاقوال تھے جو مسائل متعلق عبادت تھے احکام فقہ ہو گئے۔ اخلاق کے متعلق جو اقوال تھے ان کا نام اخلاق ہوگیا۔ ترکیب جمع سے ہر ایک نے جداگانہ نام پائے۔ ورنہ سب چیزیں اس وقت موجود تھیں، البتہ ایک سو چالیس برس کے بعد جمع اور قلم بند ہوئیں۔ اس لحاظ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ صرف مرتب بعد میں ہوئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹری پورے علاج کو کہتے ہیں، خواہ اندرونی ہو یا خارجی۔ اور اس کی ہر شاخ کو لیا جائے تو جراحی جدا فن ہے اور آنکھ کا علاج علاحدہ ہے۔ اس طرح ایک شاخ بجائے خود ایک مستقل فن ہے، حالانکہ ایک ہی چیز ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحبؒ (۱) اپنے مکاتیب میں شریعت، طریقت اور حقیقت

کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ مرض کی تشخیص کا نام شریعت ہے، جو عبادت نماز وغیرہ فرائض کے احکام بتاوے گی۔یعنی ایک نسخہ لکھ دے گی۔اس نسخہ کو بوقت ضرورت استعمال کرنے اور برتنے کا نام طریقت ہے۔اور اچھا ہو جانا، شفا پا جانا حقیقت ہے۔مولانا روم نے یہ تشبیہہ دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا شناسی کیونکر پیدا ہوتی ہے۔آگ کو دور سے دیکھ کر یا اس کی گرمی محسوس کر کے یہ معلوم ہونا کہ یہ آگ ہے شریعت ہے۔اور آگ کی لپٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر متاثر ہونا طریقت ہے۔اور اس میں پڑ کر خود آگ ہو جانا حقیقت ہے:

ہیچے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

تزکیہ نفس کا نام تصوف ہے۔روح کو کینہ ہوا وحرص غصہ سے آپس کی رنجش اور طمع وغیرہ امراض سے پاک کرنے کا نام طریقت ہے۔جس طرح جسمانی بیماریاں ہوتی ہیں اسی طرح روح کو بھی قسم قسم کے امراض لاحق ہوتے ہیں۔جسم کے طبیب ڈاکٹر حکیم ہیں اور روح کے معالج انبیاء اور اولیاء ہیں۔فرق صرف مادہ اور روح کا ہے۔درخت میں تازگی اور بالیدگی کی قوت ہوتی ہے۔جس کے بغیر وہ بیکار ہے۔نہ بڑھ سکتا ہے، نہ پتہ اور شاخیں قائم رہ سکتی ہیں۔اسی قوت کا نام روح ہے۔نماز ہم بھی پڑھتے ہیں، مگر ہماری نماز اور عارف کی نماز میں بہت فرق ہے۔گو دیکھنے میں وہ ہماری طرح رکوع اور سجود کرتا ہے مگر باطن میں نماز اس کی کچھ اور ہی چیز ہے۔آیت اور تلاوت تو وہ ہماری ہی طرح کرتا ہے مگر وہ عن الفحشاء والمنکر کا پورا عامل ہوتا ہے۔وہ شریعت سے ایک اندرونی جدا طریقہ ہے۔شریعت بیرونی محافظ ہے۔اور آپ نے سنا ہوگا:

محتسب را درون خانہ چہ کار

ماہ رمضان المبارک میں بعض اسلامی ممالک کے اندر شراب سر بازار فروخت نہیں

ہوسکتی۔اگرایسا ہوتومحتسب پکڑلے۔مگرکوئی گھرکے اندر بیچےتو اس پرمحتسب کا کیا زور چل سکتا ہے۔ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شب کوگشت لگا رہے تھے۔ایک مکان سے گانے کی آواز آئی۔آپ نے سمجھ لیا کہ یہاں منہیات شرعی ہورہی ہیں۔اس خیال سے آپ مکان کی پشت کی جانب سے جا کر مانع ہوئے۔مکان دار نے کہا کہ حضرت اگر مجھ سے ایک گناہ ہوا ہےتو آپ سے دوگناہ سرزد ہوئے۔اول یہ کہ مکان کے باہر کے دروازہ سے آنے کا حکم ہے اور آپ نے اس کی خلاف ورزی کی ہے۔آپ خاموش واپس چلے گئے۔یہ معنی شریعت ظاہری کے ہیں۔اوران احکام کا پابند ہونا تصوف ہے:

ما بروں را ننگریم وقال را
مادروں را بنگریم وحال را

صحابہ کرامؓ مختلف طور سے تلقین پاتے تھے۔استعداد کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تعلیم دیتے تھے۔صحابہؓ کی جیسی حالتیں مختلف تھیں ویسی ہی جداگانہ ان کی تعلیم تھی۔مثلاً خالد بن ولیدؓ سپہ سالار۔حضرت ابوہریرہؓ نے چھ ہزار حدیث جمع کی۔اصحاب صفہ اسی[۸۰] تھے،جن کا کام یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر مسجد کے چبوترہ پر بیٹھ رہیں اور شب وروز عبادت میں گذار دیں۔ان کی خوراک صرف یہ تھی کہ مال دار صحابہ کھجور کے خوشے لا کر محراب مسجد میں لٹکا دیتے تھے جن سے کھجوریں ایک ایک دودو ٹپکتی تھیں اور وہ اصحاب صفہ میں سے جس کے حصہ میں آجائیں اسی کی خوراک ہوتیں اور جن کو کھجوریں نہ ملتیں اور بھوک کی شدت ہوتی وہ پیٹ سے پتھر باندھ لیتے تھے۔ایک صحابی کو جب کئی روز متواتر فاقے ہوئے اور پتھر باندھنے پر بھی ان کی سیری نہ ہوئی تو انہوں نے تلاش خوراک کی اس طرح شروع کی کہ اس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو جو شخص اس مسئلہ کو بتاتا دریافت کرنے والے کو کھانا بھی اپنے پاس سے کھلاتا۔چنانچہ جب وہ صحابی چلے تو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق نظر پڑے۔ان سے مسئلہ دریافت کیا مگر ان کے پاس کچھ

موجود نہ تھا جوان کو کھانے کو دیتے ،اس لئے وہ طرح دے کر آگے بڑھ گئے ۔ پھر حضرت فاروق آرہے تھے،ان سے اس صحابی نے مسئلہ دریافت کیا۔ وہاں بھی کچھ نہ تھا،اس لئے وہ بھی آگے بڑھ گئے ۔ان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے۔ جب ان سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے حال پوچھا۔ گھر لے گئے اور تھوڑا دودھ پلایا۔

غرض جس صحابی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مادہ زیادہ پاتے تھے اسی کے موافق تعلیم دیتے تھے۔ غبی ذہین ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ان کو ایک پیمانہ پر لانا نبوت کی کمی اور نقص کا باعث ہے۔اور خدا تعالی خاتم النبیین کی شان میں فرماتا ہے۔ اکملت لکم دینکم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میری مثال اس دیوار کی ہے جو تعمیر ہو کر تیار ہوگئی ہے۔صرف ایک اینٹ کی جگہ اس میں خالی ہے۔

ہمہ رنگی آفتاب ماہتاب چراغ ستارے سب چیزیں جدا جدا صورت میں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلقین امیر غریب کے لئے یکساں تھی۔ وہ سب کو تارک الدنیا بنانا چاہتے تھے۔آپ کا قول تھا کہ دولت مند بہشت میں داخل نہیں ہوں گے۔ تحقیق یہ تھی صلاحیت جس نیکی کی جس شخص میں دیکھی اسی کی طرف اس کو بڑھایا اور درجہ تکمیل کو پہنچایا۔ امیر معاویہ کو بے نظیر ملکی مدبر بنادیا۔ فقر کا حصہ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت علیؓ پر ختم ہے اور یہ سلسلہ انہیں دونوں حضرات پر منتہی ہوتا ہے۔ایک مرتبہ جنگ میں حضرت علیؓ کے جسم کے اندر ایک تیر ایسا پیوست ہوا کہ وہ کسی طرح نہ نکل سکا۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت ہم نماز میں مشغول ہوں اس وقت یہ تیر نکال لیا جائے۔ چنانچہ جس وقت آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے تیر نکالا گیا۔ گوشت میں ٹانکے لگے ۔ زخم کی مرہم پٹی ہوئی، مگر آپ کو مطلق خبر نہ ہوئی ۔ یہ ہے عارفوں کی نماز اور حقیقی نماز۔اس لحاظ سے ابوہاشم صوفی اول تھے۔مسئلہ وحدۃ الوجود کا پرتو اور حقیقی وجود کی مثال درخت کے سایہ کی ہے کہ سایہ بھی مثل درخت کے ہے اور متحرک بھی ہوتا ہے۔مگر درخت سے بالکل علاحدہ چیز ہے اور دیکھا

جائے تو کچھ بھی نہیں، اسی کے وجود کا پرتو ہے۔ اسی طرح یہ عالم اسی وجود کا پرتو ہیں۔ اور یہ تمام صورتیں اسی ایک ذات کے نتائج ہیں۔ جس طرح چراغ کی روشنی ہم تنہائی میں محسوس کرتے ہیں، مگر آفتاب کی روشنی میں اگر چراغ جلایا جائے تو ہم کو چراغ کی روشنی بالکل دکھائی نہ دے گی۔ حالانکہ موجود ہوگی۔ اسی طرح ہم ممکنات ہیں اور خدا کے وجود کے سامنے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ شہود کی دلیل ہے۔ مگر جو یہ کہتے ہیں کہ ہم وہی ہیں۔ دراصل ایک ہی وجود ہے جو سب جگہ موجود ہے۔ بات یہ ہے کہ سب خدا تعالیٰ ہی کے مظاہر ہیں:

یاوحدت حق بہ کثرت خلق چہ پاک
گر صد جائے گرہ زنی رشتہ یک است

بجز دھاگے کے کچھ نہیں ہے۔ گرہ بذات خود کوئی وجود نہیں رکھتی۔ گو اس کا نام بالکل علاحدہ ہے۔ یہ خدا کے وجود کا فلسفہ سے ثبوت ہوا۔

قرآن شریف میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے یہ بزرگ استدلال کرتے اور حجت لاتے ہیں۔ قرآن شریف کا کلام ایسا پر معنی ہے کہ ہر شخص اس سے جداگانہ مطلب سمجھتا ہے۔ مثلاً مسح کی نسبت ایک امام فرماتے ہیں کہ سارے سر کا مسح کرنا چاہئے۔ دوسرے ارشاد کرتے ہیں کہ نصف سر کا لازمی ہے۔ تیسرے ایک بال کا تر ہو جانا کافی خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ الفاظ ایک ہی ہیں، مگر تین جداگانہ طور پر مسئلے اس سے سمجھے جاتے ہیں۔ مجتہد کو ہر مسئلہ کی ایجاد پر دس ثواب ہوتے ہیں اور وہ غلطی بھی کرے تب بھی ایک ثواب کا وہ ضرور مستحق ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت سفر میں چند صحابیوںؓ سے ارشاد فرمایا کہ نماز عصر کی ہمارے ساتھ پڑھنا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ نماز عصر کا وقت تنگ ہونے لگا تو بعض کی ان میں سے یہ رائے ہوئی کہ نماز پڑھ لینی چاہئے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تھا کہ ہمارے پاس پہنچ جاؤ تو ہمارے ساتھ پڑھنا۔ اور بعض نے ان میں سے

یہ خیال کیا کہ نہیں حضورؐ کا یہ فرمان تھا کہ نماز ہمارے ہی ساتھ پڑھنا چاہے کتنا وقت تنگ رہ جائے۔ چنانچہ بعض نے نماز ادا کی۔ بعض نے قضا کی۔ اور منزل پر پہنچ کر دونوں فریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش ہوئے اور اپنا اپنا حال عرض کیا۔ حضور نے دونوں کو معاف کر دیا۔ اس وجہ سے کہ وہ الفاظ ہی ایسے تھے جن سے دونوں نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق مطلب سمجھا تھا۔ اسی طرح قرآن شریف کا کلام پاک ہے۔ اس میں سب کچھ ہے، مگر سمجھنے والا چاہئے۔ **ھوا لاول ھوالآخر ھو الظاھر ھوالباطن** سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ظاہر اور باطن میں وہی ہے۔ اوراسی سے ان بزرگوں کا یہ مسئلہ ثابت ہوجاتا ہے۔ ہاں جولوگ یہ کہیں کہ میں خدا ہوں وہ پکے موحد نہیں۔ اسی لئے منصور کو سزا دی گئی۔ سولی پر چڑھایا گیا، کیونکہ اس نے میں! اپنے کو خدا سے جدا ٹھہرایا۔ اگر وہ یہ کہتا کہ خدا ہی خدا ہے تو ٹھیک تھا۔ اس نے پہلے میں کہا جس سے سمجھا گیا کہ خدا کی ذات سے میں کوئی علاحدہ چیز ہے۔ یہ وحدت نہ رہی۔

تصوف کا اثر اخلاق پر اور جذبات پر پڑتا ہے۔ جس سے عالم گیر صبر و رضا پھیلتی ہے۔ وحدۃ الوجود کا مسئلہ کفر بدباطنی کے خبائث کو دل سے مٹاتا ہے:

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ما است سینہ چو آئینہ داشتن

زیں عشق بہ کونین صلح کردم
تو خصم باش ورنا دوستی تماشا کن

ایک صوفی صاحب کا یہ قول تھا کہ سورج میرے حکم پر طلوع وغروب ہوتا ہے۔ آسمان و زمین میرے اشارہ پر حرکت کرتے ہیں۔ نظام عالم میرے ہی واسطے قائم ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے اپنی ہستی کو محو کر دیا تھا اور فنا فی اللہ کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔

یا یوں کہئے کہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہوتا اس کو وہ اپنی مرضی کے موافق سمجھ کر راضی ہو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ رضینا بالقضا کا مسئلہ بغیر توحید وجودی کے پیدا نہیں ہوتا:

روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　نامے تو بہر زباں کہ گویند نکوست
دل جز غم عشق نہ جوید ہرگز　　یا جز در رہ نہ ہوید ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد　　تا مہر کسے جز تو نہ روید ہرگز

ایک صوفی کو شیخ الاسلام ہرات نے کافر کہا تو صوفی نے اپنے ہی نفس کو ملامت کی کہ میں تجھ کو پچاس سال سے کہتا تھا کہ اے نفس تو کافر ہے مگر تجھ کو یقین نہ آتا تھا۔ اب شیخ الاسلام کی زبان سے سن کر تو تجھ کو یقین آیا کہ تو کافر ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر شریف میں جس وقت تشریف لائے ہیں تو ان کے قلب کی تلوار اور روحانی اثر سے صدہا مسلمان ہو گئے۔ ان کے پاس سوائے روحانی اثر کے اور کیا تھا۔؟

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شام پر چڑھائی تھی۔ یادگار زمانہ ہے کہ وہ زبانی تصفیہ کی درخواست پر مدینہ سے ایک اونٹ اور ایک غلام لے کر روانہ ہوئے۔ غلام سے یہ قرار پایا کہ تین تین کوس کی باری رہی۔ پہلے ہم تین کوس اونٹ پر سوار ہوں پھر تم سوار ہونا۔ اور اسی طرح یہ سفر طے کیا جائے گا۔ چنانچہ جب سفر ختم کے قریب پہنچا تو غلام کی باری سواری کی تھی۔ غلام نے عرض کیا کہ شان وشوکت دکھانے کا موقع آ گیا۔ اب آپ سوار ہو لیجئے۔ میں اونٹ پر سے اتر جاتا ہوں۔ مگر آپ نے نہ مانا اور خلاف باری اونٹ پر سوار ہونا منظور نہ کیا۔ اس حالت نے ایسا اثر ڈالا کہ ہزاروں کفار مسلمان ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ ہر چہ از دل خیزد بدل نشیند:

ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ بادوستانت خلاف است و جنگ

عقائد کے بعد علم کا درجہ ہے۔علم کو صوفیائے کرام دوقسم کا بتاتے ہیں۔ان کا مقصد علم ظاہری نہیں جو حواس کے ذریعہ معلوم ہو سکے۔ بلکہ دل کو صاف کرنا اور اور توجہ کرنا۔ انکشاف قلب ہوکر ہر شی کا علم ہوتا ہے۔قدر ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی ۔

امام غزالیؒ نے بعد عرصہ بسیار کے یہ درجہ حاصل کیا تھا۔جب ایک گنبد میں جا کر گوشہ نشیں ہوئے تھے۔اس وقت فرمایا تھا:

فکان ماکان ممالست الذکری

فظن خیراً ولا تسئلہ ضمیری

جب ایسے عالم یہاں آ کر قائل ہو جاتے ہیں تو ہم کس شمار میں ہیں۔علم کے بعد اخلاق ہے۔نفس کشی، تواضع، انکسار اور اخلاص خاص ہے۔جس کے معنی ہیں اکہرا کر دینا۔ جو مسلمانوں میں آج کل مفقود ہے۔یعنی جو کام کرتے ہیں اس میں ان کی ظاہری نیت اور ہوتی ہے اور باطن میں مقصود کچھ اور ہوتا ہے۔

اگر مدرسہ قائم کر کے فیض پہنچانا چاہیں گے تو اس میں اپنے کسی عزیز کو ملازم کرانا اور خود مولوی صاحب کہلانے کا منشاء ضرور ہوگا۔یہ نفس کی چوریاں ہیں جن کو اگلے لوگ نہیں جانتے تھے۔مگر ہم دیدہ ودانستہ ان خبائث سے باوجود آگاہ ہونے کے ان کو کرتے ہیں۔

ایک مولوی صاحب نے ایک شہر میں وعظ کہا۔دوسرے واعظ نے زیادہ اثر ڈالا۔ پہلا واعظ اس نے بجائے خوش ہونے کے حسد کرنے لگا۔یہ اخلاص ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ خدا غیرت مند ہے۔وہ دوسرے کو چاہتا نہیں دیکھ سکتا۔یہی حال اس کے علم کا ہے۔

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

شبلی نعمانی (۲)

خودی سے بے خودی میں آجو جوش حق پرستی ہے

جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل ! وہ ہستی ہے

کیا جانے کسے دیکھ رہا ہوں میں بتوں میں
آنکھوں میں ہے کچھ دل میں بسا اور ہی کچھ ہے

دل میں تم، آنکھ میں تم، کعبہ میں تم ، دیر میں تم
تم جہاں چاہو چھپو، ہم تمہیں پہچان گئے ہیں

خورشید بھی اس نور کا مظہر ہے قمر بھی
اے بے بصر و کچھ تمہیں آتا ہے نظر میں
دوسرا کون ہے جہاں تو ہے
کون جانے تجھے کہاں تو ہے

لاکھ پردوں میں ہے تو بے پردہ
سو نشانوں پہ بے نشاں تو ہے

تو ہی خلوت میں تو ہی جلوت میں
کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے

نہیں تیرے سوا جہاں کوئی
میزباں تو ہے میہماں تو ہے

جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی
جان کہتی ہے جان جاں تو ہے

امیر مینائی (۳)

تعلیقات وحواشی

(۱) قاضی ثناء اللہ پانی پتی [۱۷۳۰-۱۸۱۰ء] اپنے عہد کے نامور محدث، محقق اور فقیہ تھے۔ تصوف وسلوک میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ان میں تفسیر مظہری جو ۷/ ضخیم جلدوں میں ہے زیادہ مشہور ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی سے تحصیل علم کے بعد اپنے وطن پانی پت کو اپنا مسکن بنایا اور مدۃ العمر ان کا فیض جاری رہا۔ ۸۹ یا ۸۰/ سال کی عمر ۱۸۱۰ء میں پانی پت میں وفات پائی۔

(۲) علامہ شبلی کا یہ شعر اور کہیں نہیں ملتا۔ گویا یہ ان کے کلام میں ایک اضافہ ہے۔

(۳) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، جنوری ۱۹۱۰ء ص ۱-۱۰۔ اخیر کے اشعار امیر مینائی کے ہیں۔

(مطبوعہ: ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۲۰۲۰ء)

○○○

[۱۲]

جبری ابتدائی تعلیم بل

حضرات!

بہت سے بولنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کو بولنے کا مرض ہوتا ہے۔لیکن اس مسئلہ سے چونکہ مسلمانوں کی حیات وممات کا تعلق ہے ،لہٰذا میری رائے جواس بل پر ہے،اس کا اس وقت ظاہر کرنا ضروری اور مناسب سمجھتا ہوں۔گورنمنٹ نے جب اس ملک میں تعلیم جاری کی تو سرکاری کالجوں اور مدرسوں کے دروازے یکساں طور پر ہر مذہب اورملت کے لوگوں کے لئے کھول دئے۔لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ آپ کسی سال کی فہرست اٹھا کر دیکھئے اور اعداد کا مقابلہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمان تعلیم کے ہر شعبہ میں اپنی ہم سایہ قوم سے کس قدر کم ہیں۔ہمارے نواب وقارالملک صاحب (۱) نے فرمایا ہے کہ جبر اس وقت ہونا چاہئے جب اختیاری تدابیر سے کام نہ نکلے۔لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ سو برس سے جو اختیاری تدابیر عمل میں لائی گئیں ہیں، ان سے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اب تک کیا فائدہ حاصل ہوا ہے۔؟ آبادی کے لحاظ سے اس وقت جو نسبت ہندو مسلمانوں کی ہے،یعنی ایک اور پانچ۔اس کے مقابلہ میں تعلیم کے اعتبار سے مسلمانوں کی نسبتی تعداد اور بھی کم نظر آئے گی۔

جبری تعلیم کے اجرا سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا اوسط ان کی مردم

شماری کے اوسط کے برابر ہو جائے گا۔نواب وقار الملک بہادر نے جو احتمال اس تحریک کے متعلق ظاہر فرمایا ہے میری رائے میں وہ شاعرانہ احتمال سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔

اسلام کے لئے علم لازمی ہے۔ جہاں اسلام ہوگا وہاں علم ہوگا۔اسلام سے پیش تر عرب میں جو جہالت طاری تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تمام عرب میں صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔لیکن اگر کوئی شخص ان حالات سے نتیجہ اخذ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اسلام کے شروع ہوتے ہی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں لاکھوں آدمی نہ صرف پڑھنا لکھنا جانتے تھے بلکہ مختلف علوم وفنون میں کئی ہزار علماء پیدا ہو گئے تھے۔ترکوں کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔اسلام قبول کرنے سے پیشتر جہالت ان میں عام طور پر پائی جاتی تھی۔لوٹ اور ماران کا خاص پیشہ تھا،لیکن اسلام لانے کے بعد ان میں ابوالنصر جیسے لوگ پیدا ہوئے۔فقہ حنفی کے بانی مبانی بھی ترک ہی ہیں۔

غرض اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کے ساتھ علم وفضل ہونا لازمی ہے۔مسلمانوں پر قرآن مجید کا پڑھنا واجب ہے۔لیکن صرف طوطوں کی طرح رٹ کر پڑھنا نہیں بلکہ سمجھ کر پڑھنا اور سمجھ کر پڑھنے کے لئے علم لازمی ہے۔اور یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے امراء اور غرباء میں عام تعلیم ہمیشہ جاری رہی ہے۔اور غرباء کے گروہوں میں سے ہمیشہ بڑے سے بڑے جید عالم پیدا ہوئے ہیں، جس پر اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۲) اسی گروہ میں سے تھے۔امراء کے طبقہ میں سے بھی علم وفضل کا وہ عالم تھا کہ یورپ آج تک ایسے عالم بادشاہ نہیں دکھلا سکا، جیسے مسلمان بادشاہ ہوئے ہیں۔اور حقیقت میں کسی قوم کی حالت معلوم کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ایک یہ کہ قوم کے عوام کا علم،تہذیب اور شائستگی میں کیا درجہ ہے۔دوسرے ان کے امراء کی علمی حیثیت کیسی ہے۔خلیفہ معتصم باللہ، سیف الدولہ، محقق طوسی، عبداللہ ابن عباس، بوعلی سینا، عالم گیر وغیرہ

یہ وہ لوگ ہیں جو خود بادشاہ ہیں۔ یا بادشاہوں کے وزیر تھے اور یہ سب اس شان کے لوگ گذرے ہیں جن کے علم وفضل پر نہ صرف ہماری قوم بلکہ دنیا فخر کرتی ہے۔

قانون تعلیم جبریہ کا منشاء عوام میں تعلیم پھیلانا ہے اور یہ وہ اصول ہے جو سراسر اسلام کے موافق ہے۔ مسلمانوں کو جن کا گوشت پوست علم سے بنا ہے اس تحریک کی مخالفت کرنا بے حد تعجب انگیز ہے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کے خاص حقوق اور مقاصد کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق ہم چند شرطوں کے ساتھ اس بل کو منظور کرتے ہیں، لیکن اصول میں اختلاف ہم کو ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔'' (۳)

تعلیقات وحواشی

(۱) نواب وقارالملک [۱۸۴۱-۱۹۱۷ء] کا نام مشتاق حسین تھا۔ اصلاً سراواں ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے، مگر بچپن میں والد کے انتقال کے سبب ان کی والدہ امروہہ چلی آئیں اور پھر یہی ان کا وطن ٹھہرا۔ یہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی اور یہیں ایک اسکول میں مدرس ہوئے، پھر محرر ہو کر مرادآباد آئے۔ قحط کے زمانہ میں سرسید احمد کا خاں کا تبادلہ مرادآباد ہوا تو انہوں نے نواب وقارالملک کو راحت کاری کے کاموں کا ذمہ دار بنایا، جسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔ یہیں ایک دوسرے سے گہرے مراسم قائم ہوئے جو ہمیشہ باقی رہے۔ نواب وقارالملک نے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ریاست حیدرآباد سے بھی وابستہ رہے۔ پھر وہ علی گڑھ آئے اور سرسید کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ مسلم لیگ کے قیام میں ان کی آراء کو بھی دخل تھا۔ وہ علی گڑھ میں بورڈ آف ٹرسٹی کے آنریری سکریٹری نامزد ہوئے۔ انہیں کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک برپا ہوئی اور انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں لگا کر اتنا چندہ جمع کیا کہ یونیورسٹی کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ ۲۷ رجنوری ۱۹۱۷ء کو امروہہ میں وفات پائی۔ علامہ شبلی نعمانی سے گہرے مراسم تھے۔ خط وکتابت بھی تھی۔ مکاتیب شبلی جلد اول اور مکتوبات شبلی میں ان کے نام کل تین خطوط شامل ہیں۔ ان سے بھی گہرے

تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ [۶۹۹-۷۶۷ء] علامہ شبلی نعمانی نے ان کی بڑی محققانہ اور بہت مفصل سوانح عمری ''سیرۃ النعمان'' لکھی ہے۔ اور اسے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ مسلسل شائع کر رہا ہے۔

(۳) رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ء ص ۲۰۲-۲۰۵

ooo

[۱۳]

عورت اور اسلام

حضرات!

بعض محاورات زبانوں پر اس قسم کے چڑھ جاتے ہیں جو محض بطور رسم کے استعمال ہوتے ہیں اوران سے کوئی حقیقی معنی مراد نہیں ہوتی۔ازاں جملہ ایک ''عزت'' کا لفظ ہے جو اکثر مقرر استعمال کیا کرتے ہیں۔لیکن اس وقت کے جلسہ میں جب کہ ایک ایسی والیہ ملک جو نہ صرف جان و مال پر حکومت کررہی ہیں بلکہ دلوں کی مالک ہیں، یہاں تشریف فرما ہیں تو اس موقع پر تقریر کرنا درحقیقت ایک عزت ہوگی۔اسلام تفرقے مٹانے کے لئے دنیا میں آیا تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ صاف کہہ دینے کا حکم ہوا کہ ''انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی .(کھف. ۱۱۰) یعنی میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں،فرق صرف یہ ہے مجھ پر وحی آتی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین من حیث الانسان اپنے آپ میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ایک بار ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر مرعوب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے کیوں ڈرتے ہو؟ بحالیکہ میں ایک بیوہ قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔حضرت عمرؓ کو دیکھا جاتا تھا کہ کبھی آپ خارشتی اونٹوں کے جسم پر اپنے ہاتھ سے تیل مل رہے ہیں۔کبھی کچی اینٹ سر کے نیچے رکھے ہوئے زمین پر پڑے سو رہے ہیں۔حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اپنی خلافت کے زمانہ

میں ایک یہودی کے مقابلہ میں عدالت جا کر ایک معمولی فریق کی حیثیت سے شہادت دی تھی۔ مگر بعد میں تفرقے پڑ گئے۔ ہم اس مساوات کے لئے ترس رہے ہیں جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ اور آج جو سماں پیش نظر ہے وہ صدیوں بعد دیکھنے میں آیا ہے۔ جب کہ ایک والیہ ریاست ان لوگوں کے درمیان تشریف فرما ہیں جو ان کی رعایا اور خادم کے طور پر ہیں۔ یہی تفرقہ وجہ ہے عورتوں میں تعلیم کے سوال کے پیدا ہونے کی۔ ورنہ مردوں کو کیا حق ہے وہ عورتوں کی نسبت یہ طے کریں کہ ان کی اس قسم کی تعلیم ہونی چاہئے اور اس قسم کی تعلیم نہیں ہونی چاہئے۔ دنیا کے ہر حصہ میں اور ہر زمانہ میں عورتوں کا درجہ نہایت پست رہا ہے۔ ہندوستان میں دختر کشی کی نالائق رسم اب تک رہی ہے۔ فلاطون کا قول تھا کہ رسم ورواج ازدواج پر مجبور کرتے ہیں، ورنہ عورتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مردوں کے ہم پایہ رکھا جائے اور برابر جگہ دی جائے۔ انگلستان میں انیسویں صدی تک یہ قاعدہ تھا کہ شادی کے بعد عورت کو اپنے مال پر کچھ اختیار نہیں رہتا تھا۔ عرب میں عورت کے ساتھ یہ سلوک ہوتا تھا کہ "اذا بشر احدهم بالانثیٰ ظل وجه مسودا وهو كظيم.(نحل.۵۸) (جس وقت ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تھی تو اس کا چہرہ (بوجہ غم کے) سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ دل میں پیچ وتاب کھاتا تھا۔) لیکن اسلام نے مرد وعورت کے درمیان مساوات قائم کی اور حکم دیا کہ "ولهن مثل الذی علیهن.(بقره.۲۲۸) (ان کے وہی حقوق ہیں جو ان پر ہیں۔) اور للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن. (نســـــاء.۳۲) (یعنی جو مرد کمائیں وہ ان (مردوں) کا ہے اور جو عورتیں کمائیں وہ ان (عورتوں) کا ہے اور یہ کہ "وجعل بينكم مودة ورحمة .(روم.۲۱) (تمہارے درمیان محبت اور رحم کا سلسلہ قائم کیا) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خيـــــركـــم خيركم نساء كم لاهله "(تم میں اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے اچھے ہیں۔) آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے "فقاً بالقوارير "(ان آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔) آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم پہ سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ ایمان لائی تھیں۔ سب سے پہلے شہید ایک صحابیہ عورت تھیں جو ابو جہل کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوئیں تھیں۔ غزوۂ احد میں ایک صحابیہؓ کو اپنے بیٹے اور شوہر کے قتل کے پیاپے خبریں ملنے کے باوجود جب ان کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کی اطلاع ملی (جس کا ان کو سخت انتظار تھا) تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ '' لاھم رویتک یا محمد ''(اے محمدؐ! آپ کے دیدار کے بعد بیٹے اور شوہر کے قتل کا کیا غم ہوسکتا ہے۔) اس سے عورت کی قوت ایمانیہ کا پتہ چلتا ہے۔ تین سو سال تک عورتوں کی مردوں کے ساتھ مساوات قائم رہی۔ ہندوستان کے زریں عہد میں گلبدن بیگم [دختر بابر] نور جہاں بیگم، جہاں آرا بیگم [دختر شاہ جہاں] اور زیب النساء [دختر اورنگزیب] ایسی فاضلہ عورتیں تھیں کہ بیان سے باہر ہے۔ گلبدن بیگم کا ''ہمایوں نامہ'' [سوانح ہمایوں] اور جہاں آرا بیگم کی ''مونس الارواح'' [سوانح حضرت معین الدین چشتیؒ] بے نظیر کتابیں ہیں۔ پردہ مانع تعلیم نہیں ہے اور نہ پردہ کوئی خارج از اسلام شے ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان عورتیں بے پردہ دربار وغیرہ میں شریک ہوتی رہی ہوں۔ اس کے خلاف کہنا اسلام پر سخت اتہام لگانا ہے۔ فرض کیجیے کہ عورتوں کو تعلیم دلانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن آپ مردوں کی تعلیم ہی کے لئے عورتوں کو تعلیم دلائیں؟ کیوں کہ بچہ کی تعلیم اس کے وجود میں آنے کے وقت ہی سے شروع ہو جانی چاہیئے، اور بغیر عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے ممکن نہیں ہے۔ (۲)

تعلیقات و حواشی

(۱) رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ء ص ۱۶۶-۱۶۹

○○○

[۱۴]

مدرسہ انوار العلوم حیدر آباد

بانی مدرسہ، صدر مدرسہ ومعزز حاضرین!

صدر مدرسہ اور بانی مدرسہ نے مجھ سے خواہش کی کہ مدرسہ انوار العلوم کا معائنہ کروں(۱) تو ایک تو مدرسہ کے نام کی کشش ہوئی اور دوسرے تیمور(۲) ہونے کے باوجود مجھ سے عذر لنگ نہ ہوسکا اور میں معائنہ کے لئے تیار ہو گیا۔

آج یہاں آیا تو مجھے مدرسہ کی تمام جماعتیں دکھائی گئیں اور بتایا گیا کہ حکومت کی امداد کے بغیر مدرسہ چلایا جا رہا ہے۔ طلبہ میں نظم وضبط اور اساتذہ میں انہماک ومستعدی دیکھ کر میں بہت محظوظ ہوا۔ اور اس بات سے بھی مجھے بہت خوشی ہوئی کہ بانی مدرسہ(۳) نے اپنی زندگی مدرسہ کی فلاح و بہبودی وترقی کے واسطے وقف کردی ہے۔ اور صدر مدرسہ ایک پرجوش نوجوان خود علی گڑھ کالج میں سائنس کی تعلیم پا رہے ہیں قومی خدمت پر کمر بستہ ہیں۔ نوعمری میں ان کا یہ جذبہ خدمت ملک وملت قابل قدر ہے۔ اس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔

مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ان کی بے دینی ہے۔ اگر وہ صحیح معنوں میں اسلامی ضابطہ پر عمل پیرا رہتے تو آج اس پس ماندگی سے دوچار نہ ہوتے۔ ان میں نہ قوت علمیہ باقی ہے نہ طاقت سپہ گری۔ ان کی ترقی کی واحد تدبیر یہی ہے کہ انہیں اسلامی تعلیمات

سے آراستہ کیا جائے۔اور جدید علوم فنون سکھائے جائیں اور انگریزی تعلیم لازم کردی جائے۔اس خصوص میں یہ امراز بس ضروری ہے کہ ہماری تعلیم ہمارے ہی ہاتھوں میں رہے۔غیروں پر تکیہ نہ کیا جائے۔اور ہم اپنی طرز زندگی قدیم وجدید تعلیم کے مرکب سانچے میں ڈھالیں۔جدید علوم وفنون سے طلبہ کو بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔اور ہماری درس گاہوں سے قابل افراد نکلیں گے۔جس کے سبب سے ہماری قوم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا مقابلہ کر سکے گی۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے کارساز مدرسہ کو ایسا فروغ بخشے کہ یہ کالج بن جائے۔(۴) ایسا ہی جیسا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنا اور آج علی گڑھ کالج کے نام سے مشہور ہے اور اس مدرسہ کے طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملک وملت کا نام روشن کریں۔اور ہر جگہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جائیں۔

[اصلاحات غالب ص۲۰-۲۱]

تعلیقات وحواشی:

(۱) اس معائنہ کی رپورٹ مولوی عبدالرزاق راشد نے ''اصلاحات غالب'' میں سپرد قلم کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''موقع غنیمت جان کر بانی مدرسہ کے ساتھ مولانا شبلی سے شرف نیاز حاصل کر کے میں نے مدرسہ کے معائنہ اور طلبہ کو مخاطب کرنے کی درخواست کی۔مولانا نے مہربانی سے معاً آمادگی ظاہر کی اور معائنہ مدرسہ کی تاریخ خود ہی مقرر فرمائی اور تاریخ مقررہ پر پر شام کے پانچ بجے مدرسہ میں رونق افروز ہوئے۔لوگ تین ہی بجے سے جوق در جوق آنے لگے اور پانچ بجے تک مدرسہ کا سب سے بڑا ہال کھچا کھچ

بھر گیا۔ میں نے مولانا کو مدرسہ دکھانے کے بعد تعارف کے طور پر کہا کہ ''یوں تو ملک میں بہت سے علماء ہیں مگر ان کے کام درس وتدریس یا وعظ و پند و نصائح تک محدود ہیں۔ وہ اقتضائے زمانہ سے بالکل بے خبر اور پرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ ہم کو ایسے روشن خیال علماء کی ضرورت ہے جیسے مولانا شبلی ہیں۔ جن کے علم وفضل کی دھاک سارے ملک میں بیٹھی ہوئی ہے اور جن کی بصیرت افروز تصنیفات کا حوالہ براؤن جیسے مستشرق نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں دیا ہے۔ صرف ہند ہی میں نہیں بلکہ بیرون ہند بھی مولانا کی کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ مولانا کرسی صدارت کو زینت بخشیں اور اپنے گراں قدر خیالات سے حاضری جلسہ کو مستفید فرمائیں۔'' (اصلاحات غالب ص ۱۹)

علامہ شبلی کے خطاب کے بعد اسی طرح کے جذبات کا اظہار مولوی محمد عبدالرزاق بانی مدرسہ انوار العلوم نے بھی کیا اور فرمایا کہ

''آج ہم اپنی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کریں بجا ہے، کیونکہ ہمارے درمیان ایسی شمع علم موجود ہے جس کے نور سے ملک کے تمام خطے منور ہیں۔ اور علمی حلقے مولانا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ جو مشورے مدرسہ کی ترقی کے بارے میں مولانا نے دئے ہیں ہمارے حق میں گنج گراں مایہ ہیں۔ ہم ان پر ان شاء اللہ عمل کریں گے۔

(ایضاً ص ۲۱)

(۲) ۱۷ر مئی ۱۹۰۷ء کو گھر میں کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی ہوئی تھی، علامہ شبلی نے اپنی بہو سے بندوق دوسری جگہ رکھنے کو کہا۔ بے خیالی میں بندوق سر ہو گئی اور سیدھا علامہ کی پنڈلی میں لگی،

جس سے وہ چور چور ہوگئی۔اس وجہ سے علامہ کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا تھا۔اس حادثہ پا پر شعرا نے متعدد قطعات اور رباعیاں کہیں۔علامہ کبھی کبھی اس کی طرف اشارہ کر کے از راہ تفنن خود کو تیمور کہا کرتے تھے۔

(۳) مدرسہ انوارالعلوم محلّہ نامپلی حیدرآباد کے بانی مولوی محمد عبدالرزاق حیدرآبادی تھے۔جو بڑے نیک اور ایک مخلص انسان تھے۔

(۴) مولانا عبدالرزاق راشد نے لکھا ہے کہ

> ''بحمداللہ مولانا شبلی کی دعا بارگاہ رب العزت میں مقبول ہوئی۔آج مدرسہ انوارالعلوم کالج کے درجہ تک پہنچ گیا ہے اور اس میں سیکڑوں طلبہ زیر تعلیم ہیں،کیا عجب ہے کہ آئندہ چند سالوں میں یونیورسٹی کا قالب اختیار کر لے۔''(اصلاحات غالب ص۲۲)

○○○

کتابیات

کتابیات

کتب

[آ]

- آثارِ شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

[الف]

- اصلاحاتِ غالب۔سید علی حیدر طباطبائی، مرتب مولانا عبدالرزاق راشد، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد،۱۹۶۶ء
- اقبال اور انجمن حمایت اسلام۔محمد حنیف شاہد، کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور جولائی ۱۹۷۶ء
- الغزالی۔علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۷ء
- الکلام۔علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۲ء

[ب]

- باقیاتِ شبلی۔مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی،۱۹۶۴ء
- بزمِ تیموریہ، حصہ اول۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۵ء

[ت]

- تاثرات۔ملا واحدی، مرتبہ حکیم محمد سعید، ہمدرد اکیڈمی کراچی،۱۹۷۰ء

- تذکرہ ماہ وسال ۔ مالک رام، مکتبہ جامعہ دہلی، نومبر ۱۹۹۱ء

[ح]

- حیات شبلی ۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

[خ]

- خطبات شبلی ۔ مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

[ر]

- رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس، دسمبر ۱۸۸۶ء
- رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۸ء
- رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ء
- رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۲ء
- روداد ندوۃ العلماء، لکھنو، ۱۹۰۱ء
- روداد ندوۃ العلماء، لکھنو، ۱۹۰۲ء

[ش]

- شبلی اور جہان شبلی ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
- شبلی خودنوشتوں میں ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۸ء

[ع]

- عظمت رفتہ ۔ ضیاءالدین احمد برنی، ادارہ علم وفن کراچی، ۲۰۰۰ء
- علم الکلام ۔ علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

[م]

- محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا پہلا سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء، اردو پریس لکھنو

○ مرقع کانفرنس۔انوار احمد مارہروی، مطبع مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۳۵ء

[ن]

○ نوادرات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء

[ی]

○ یادرفتگاں۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

○ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ جنوری ۲۰۱۴ء

رسائل

○ ماہنامہ الندوہ لکھنو، اپریل ۱۹۱۰ء

○ بازیافت لاہور، شبلی نمبر ۲۰۱۵ء

○ صحیفہ لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء، اکتوبر ۱۹۷۱ء

○ صحیفہ لاہور، شبلی نمبر ۲۰۱۶ء

○ مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ (شبلی نمبر) مدیر: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

○ ماہنامہ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۱ء

○ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۶۸ء، اکتوبر ۱۹۶۹ء، جولائی ۲۰۲۰ء

○ ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، جنوری ۱۹۱۰ء، دسمبر ۱۹۱۲ء

○ ہفت روزہ وکیل امرتسر، ۱۷/ اکتوبر و ۲۷/ اکتوبر ۱۹۰۲ء

○○○

اشاریہ

خطبات شبلی

(نو دریافت)

○○○

مرتبہ

مولانا عرفات اعجاز اعظمی

اشخاص

○○○

کتب ورسائل

مقامات

ooo

Darul Musannefin Shibli Academy
Azamgarh-276001(U.P.)
www.shibliacademy.org
Email: shibli_academy@rediffmail.com

ISBN 81-952765-9-8

9 788195 276592

Rs. 150/-